

آبِ حیات

(پیر کامل ص-2)



عمیرہ احمد

عمیرہ احمد

کے حکایت



3



”مجھے ہاتھ دکھانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ اس نے دلوک انکار کرتے ہوئے کہا۔
”لیکن مجھے ہے۔“ وہ اصرار کر رہی تھی۔

”سب جھوٹ ہوتا ہے۔“ اس نے بچوں کی طرح اسے ہلایا۔
 ”کلیک بلیٹ نہیں دکھانے میں کیا حرج ہے۔“ اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔
 ”محم کیا جانتا چاہتی ہو اپنے مستقبل میں کبارے میں۔ مجھ سے پوچھ لو۔“

”اے اس پامسٹ کے پاس لے جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جو اس فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں تھا جہاں وہ
 کچھ دیر پہلے کھانا کھانے کے لیے آئے تھے اور کھانے کے بعد اس کی بیوی کو پتا نہیں کہاں سے وہ پامسٹ یا آگیا
 تھا۔“

www.urduovelspdf.com

”دیری فنی“ اس نے مذاق اڑایا تھا۔ ”میں نے مستقبل کا تو تمہیں پتا نہیں میرے کا کیسے ہوگا؟“
 ”کیوں تمہارا اور میرا مستقبل ساتھ ساتھ نہیں ہے کیا؟“ اس نے مسکرا کر اسے جتایا تھا۔
 ”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں پامسٹ کے پاس چلتے ہیں اس سے پوچھتے ہیں۔“ اس کا اصرار رہا تھا۔
 ”دیکھو! ہمارا۔“ آج ”ٹھیک ہے۔ بس کافی ہے۔“ تمہیں ”کل“ کا مسئلہ کیوں ہو رہا ہے؟“ وہ اب بھی
 رضامند نہیں ہو رہا تھا۔

”مجھے ہے کل کا مسئلہ۔“ وہ کچھ جھٹا کر بولی تھی اسے شاید یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی فرمائش پر اس طرح
 کے رد عمل کا اظہار کرے گا۔

”کتنے لوگ ہاتھ دکھا کر جاتے ہیں اس پامسٹ کو۔ تمہیں پتا ہے۔ میری کو لیگز کو اس نے ان کے لیوچر کے
 بارے میں کتنا کچھ ٹھیک بتایا تھا۔ بھابھی کی بھی کتنی کزنز آئی تھیں اس کے بارے میں۔“
 وہ اب اسے قائل کرنے کے لیے مثالیں دے رہی تھی۔

”بھابھی آئی تھیں اس کے پاس؟“ اس نے چونک کر پوچھا تھا۔
 ”نہیں۔“ وہ انکی۔
 ”تو؟“

”تو یہ کہ ان کو انٹرنسٹ نہیں ہو گا۔ مجھے تو ہے۔ اور تم نہیں لے کر جاؤ گے تو میں خود چلی جاؤں گی۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔
 ”کب؟“
 ”ابھی۔“

وہ بے اختیار ہنسنا اور اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس سے کہا۔
 ”پامسٹ کو ہاتھ دکھانا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے اور میں تم سے ایسی کسی حماقت کی توقع نہیں کرتا تھا“
 لیکن اب تم ضد کر رہی ہو تو ٹھیک ہے۔ تم دکھا لو ہاتھ۔“
 ”تم نہیں دکھاؤ گے؟“ اس کے ساتھ لابی کی طرف جاتے ہوئے اس نے کہا۔
 ”نہیں۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں۔ خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ میرا اور تمہارا مستقبل ایک ہے تو جو کچھ میرے بارے میں بتائے گا وہ پامسٹ وہ تمہارے بارے میں بھی تو ہو گا۔“ وہ اب اسے چھیڑ رہی تھی۔
 ”مثلاً؟“ اس نے بھنویں اچکاتے ہوئے اس سے پوچھا۔
 ”مثلاً۔۔۔ اچھی خوش گوار ازدواجی زندگی اگر میری ہوگی تو تمہاری بھی تو ہوگی۔“
 ”ضروری نہیں ہے۔“ وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔
 ”ہو سکتا ہے شوہر کے طور پر میری زندگی بڑی گزرے تمہارے ساتھ۔“

”تو مجھے کیا؟ میری تو اچھی گزر رہی ہوگی۔“ اس نے کندھے اچکا کر اپنی بے نیازی دکھائی۔
 ”تم عورتیں بڑی سیلفش (خود غرض) ہوتی ہو۔“ اس نے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس کے رویے کی مذمت کی۔

”تو نہ کیا کرو پھر ہم سے شادی۔ نہ کیا کرو ہم سے محبت۔ ہم کون سامری جا رہی ہوتی ہیں تم مردوں کے لیے؟“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ ہنس پڑا چند لمحوں کے لیے وہ واقعی لاجواب ہو گیا تھا۔
 ”ہاں۔۔۔ ہم ہی مرے جا رہے ہوتے ہیں تم لوگوں پر۔ عزت کی زندگی راں نہیں آتی شاید اس لیے۔“ وہ چند لمحوں بعد بدبڑایا۔

”تمہارا مطلب ہے تم شادی سے پہلے عزت کی زندگی گزار رہے تھے؟“ وہ ایک دم برامان گئی تھی۔
 ”ہم شاید جنرل لاہر کر رہے تھے۔“ وہ اس کا بدلتا موڈ دیکھ کر گڑبڑایا۔

”نہیں۔۔۔ تم صرف اپنی بات کرو۔“
 ”تم اگر ناراض ہو رہی ہو تو چلو پھر پامسٹ کے پاس نہیں جاتے۔“ اس نے بے حد سہولت سے اسے موضوع سے ہٹایا تھا۔

”نہیں میں کب ناراض ہوں ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔“ اس کا موڈ ایک لمحہ میں بدلا تھا۔
 ”ویسے تم پوچھو گی کیا پامسٹ سے؟“ اس نے بات کو مزید گھمایا۔

”بڑی چیزیں ہیں۔“ اس نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر تب تک وہ پامسٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔

ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھا وہ غیر دلچسپی سے اپنی بیوی اور پامسٹ کی ابتدائی گفتگو سنتا رہا، لیکن اسے اپنی بیوی کی دلچسپی اور سنجیدگی دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

پامسٹ اب اس کا ہاتھ پکڑے عد سے کی مدت سے اس کی لکیروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے بے حد سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

”لکیروں کا علم نہ تو حتمی ہوتا ہے نہ ہی الہامی۔ ہم صرف وہی بتاتے ہیں جو لکیریں بتا رہی ہوتی ہیں۔ بہر حال مقدر بتانا سنوارنا اور رنگاڑنا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔“

وہ بات کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رکا پھر اس نے جیسے اس کے ہاتھ پر حیرانی سے کچھ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کا چہرہ دیکھا اور پھر برابر کی کرسی پر بیٹھے اس کے شوہر کو جو اس وقت اپنے بلیک میری پر کچھ مہسہ جوڑ دیکھنے میں مصروف تھا۔

”بڑی حیرانی کی بات ہے۔“ پامسٹ نے دوبارہ ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”کیا؟“ اس نے کچھ بے تاب ہو کر پامسٹ سے پوچھا۔

”آپ کی یہ پہلی شادی ہے؟“
 بلیک میری پر اپنے مہسہ چپک کرتے کرتے اس نے چونک کر پامسٹ کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا۔ یہ سوال اس کے لیے ہے لیکن پامسٹ کی مخاطب اس کی بیوی تھی۔

”ہاں۔۔۔“ اس کی بیوی نے کچھ حیران ہو کر پہلے پامسٹ اور پھر اسے دیکھ کر کہا۔
 ”اوہ! اچھا۔۔۔“ پامسٹ پھر کسی غور و غوص میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”آپ کے ہاتھ پر دو سری شادی کی لکیر ہے۔ ایک مضبوط لکیر۔ ایک خوش گوار کامیاب و سری شادی۔“
 پامسٹ نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے جیسے حتمی انداز میں کہا۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر بالکل ساکت تھا۔

آدم و حوا

اس کے پیروں کے نیچے وہ زمین جیسے سبز مٹل کی تھی۔ مٹل۔۔۔ یا کچھ اور تھا۔۔۔ تاحد نظر زمین پر سبزے کی طرح پھیلا ہوا۔۔۔ درختوں پر اگنے والی پیلی کونپلوں جیسا سبز۔ اور پھر ایک دم سمندر کے اندر پیدا ہونے والی کالی مٹی پر نکلتے لیے۔۔۔ مٹی کے ننھے ننھے قطرے اپنے وجود پر لیے سبزے کی پتیاں معطر ہوا کے جھوٹوں سے ہلتی جیسے کسی رقص میں مصروف تھیں۔۔۔ پانی کے ننھے شفاف موتی سبز پتوں کے وجود پر پھسل رہے تھے، سنبھل رہے تھے یوں جیسے مخمور ہو کر بہک رہے ہوں۔ پتوں کے وجود سے کہتے، ڈمگاتے، سنبھلتے، پھسلتے۔۔۔ پھر ہوا کا ایک ہموار چلتا سبزے میں ایک لہر اٹھتی سمندر میں جوار بھاٹا کی پہلی لہر کی طرح اٹھتی، رقص کرتی، لہراتی وہ سبزے کو

سہلاتی، سہلاتی ایک عجیب سی سرشاری میں مبتلا کرتی ایک طرف سے دوسری طرف گزر جاتی۔ زمین جیسے رقص کرنے میں مصروف تھی۔

سبزے کا وجود ننھے ننھے پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ ہر رنگ کے پھولوں سے۔ اتنے رنگ اور ایسے رنگ جو نظر کو شذر کر دیں۔ سبزے کے وجود پر بکھرے وہ ننھے ننھے پھول یہاں سے وہاں ہر جگہ تھے۔ سبزے میں ہوا سے پیدا ہونے والی ہر لہر اور ہر موج کے ساتھ وہ بھی عجیب مستی اور سرشاری سے رقص کرنے لگتے۔

آسمان صاف تھا۔ آنکھوں کو سکون دینے والا ہلکا نیلا اور اب بھی کسی گنبد کی طرح پھیلا ہوا۔ گہرا اونچا۔ بہت اونچا۔ یہاں سے وہاں تک ہر طرف۔

ہوا معطر تھی، مخمور تھی، گنگناتی تھی۔ وہاں موجود ہر شے کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔ ہنستی، چھیڑ کر جاتی پھر لیٹ کر آتی۔ کبھی بسلاتی۔ کبھی تھکتی۔ کبھی تھمتی۔ پھر چلتی۔ پھر گنگناتی۔ پھر لہرائی۔ وہاں تھی، نہیں تھی۔ کہاں تھی؟

وہ کسی راستے پر تھا۔ کیا راستہ تھا۔! وہ کسی انتظار میں تھا۔ کیا انتظار تھا۔! اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس راستے کے دونوں طرف دو رویہ درختوں کی قطار کے ایک درخت کے ساتھ وہ ٹکا کھڑا تھا۔ سہارا لیے یا سہارا لیے۔

وہ آگئی تھی۔ اس نے بہت دور اس راستے پر اسے نمودار ہوتے دیکھ لیا۔

وہ سفید لباس میں ملبوس تھی۔ بہت مہین بہت نفیس۔ وہ ریٹیم تھا۔!؟ اطلس تھا۔!؟ خواب یا وہ کچھ اور تھا؟ اتنا ہلکا۔ اتنا نازک کہ ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس سفید گاؤں نما لباس کو اڑانے لگتا۔ اس کی دو دھیانڈ لیاں نظر آنے لگتیں۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور سبزے پر دھڑے اس کے خوب صورت پاؤں جیسے سبزے کی نرمی کو برداشت نہیں کیا رہے تھے۔ وہ پاؤں رکھتی چند کھوں کے لیے لڑکھڑاتی۔ جیسے مخمور ہو کر ہنستی۔ پھر سنبھل جاتی۔ پھر بڑے اشتیاق سے ایک بار پھر قدم آگے بڑھا دیتی۔

اس کے سیاہ بال ہوا کے جھونکوں سے اس کے شانوں اور اس کی کمر تک ہلکورے کھا رہے تھے۔ اس کے گالوں اور چہرے کو چومتے آگے پیچھے جارہے تھے۔ اس کے چہرے پر آتے۔ اس کے سینے سے لپٹتے۔ اس کے کندھے پر پھر ہوا میں لہرا کر ایک بار پھر نیچے چلے جاتے۔ وہ خوب صورت سیاہ چمک دار ریٹیم زلفیں جیسے اس کے سفید لباس کے ساتھ مل کر اس کے وجود کے ساتھ رقص کرنے میں مصروف تھیں۔

اس کے مرمروں وجود پر وہ سفید لباس جیسے پھسل رہا تھا۔ سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ وہ اس کے جسم کے خدوخال کو نمایاں کرتا، اسے پیروں سے کندھوں تک چومتا۔ اس کے وجود کے لمس سے مخمور ہوتا۔ ہوش کھوتا۔ دیوانہ وار اس کے وجود کے گرد گھومتا۔ کسی بخمور کی طرح اس کے جسم کو اپنی گرفت میں لیتا اس سے لپٹ رہا تھا۔ ہوا کا وہ سرا جھونکا اس کی سیاہ ریٹیم زلفوں کو بھی اس رقص میں شامل کر دیتا۔ وہ اس کے کندھوں اور کمر پر والہانہ انداز میں پھسلتیں۔ ہوا میں ہلکا سا اڑتیں پھر نرمی اور ملاحت سے اس کے چہرے اور سینے پر گرتیں۔ اس کے وجود سے پھوٹی خوشبو سے یک دم سرشار ہوتیں۔ پھر اس کے جسم کو جیسے اپنے وجود سے چھپانے کی کوشش کرنے لگتیں۔ ہوا کا ایک اور جھونکا انہیں ہولے سے اٹھا کر پھر پیچھے پھینک دیتا۔

اس رقص میں اب پھر اس کے سفید لباس کی باری تھی۔ وہ آگے پیچھے آیا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ عجیب سی حیرت میں مبتلا وہاں کی ہر شے کو سحرزدہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ بچوں جیسی حیرت اور اشتیاق کے

ساتھ۔

اس راستے پر چلتے چلتے اس نے اسے دیکھ لیا۔ اس کے قدم تھے، دونوں کی نظریں ملیں پھر اس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی۔ پہلے مسکراہٹ پھر ہنسی۔ اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہاں موجود وہ واحد وجود تھا جسے وہ پہچانتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے قریب آگئی۔ دونوں ایک عجیب سی سرشاری میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔

اس کی گہری سیاہ مسکراتی ہوئی آنکھیں، ہیرے کی کنپٹیوں کی طرح چمک رہی تھیں اور یہ چمک اسے دیکھ کر بڑھ گئی تھی۔ اس کے خوب صورت گلابی ہونٹوں پر نمی کی ہلکی سی تہ تھی یوں جیسے وہ ابھی کچھ پی کر آئی ہو۔ اس کی ٹھوڑی ہمیشہ کی طرح اٹھی ہوئی تھی۔ اس کی صراحی وار گردن کو دیکھتے ہوئے اس نے اس کا وہ سرا ہاتھ بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ وہ جیسے اس لمس سے واقف تھی، پھر وہ دونوں بے اختیار ہنسے۔

”تم میرا انتظار کر رہے تھے؟“

”ہاں۔“

”بہت دیر کر دی؟“

”نہیں۔ بہت زیادہ نہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے اس راستے پر چلنے لگا۔

ہوا ابھی بھی ان دونوں کے وجود کے ساتھ اور وہاں موجود ہر شے کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرنے میں مصروف تھی۔

وہ اب بھی بچوں جیسی حیرت اور خوشی کے ساتھ وہاں موجود ہر شے کو کھوجنے میں مصروف تھی۔ اس کی کھلکھلاہٹ اور شفاف ہنسی وہاں فضا کو ایک نئے رنگ سے سجانے لگے تھے۔ فضا میں یک دم ایک عجیب و غریب سا ساز بجنے لگا تھا۔ وہ ٹھٹھکی، پھر بے اختیار کھلکھلائی۔ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس نے اس راستے پر قدم آگے بڑھائے، پھر مرو نے اسے دونوں بازو ہوا میں پھیلائے رقص کے انداز میں گھومتے دیکھا۔ وہ بے اختیار ہنسا۔ وہ اس راستے پر کسی ماہر نیلے ریتا کی طرح رقص کرتی دور جا رہی تھی۔ اس کے جسم پر موجود سفید لباس اس کے گھومتے جسم کے گرد ہوا میں اب کسی پھول کی طرح رقصاں تھا۔ وہ اب آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھنے لگی تھی۔ ہوا کے معطر جھونکے بڑی نرمی سے اسے جیسے اپنے ساتھ لیے جارہے تھے۔ وہ اب بھی اسی طرح ہنستی، رقص کے انداز میں بازو پھیلائے کھوم رہی تھی۔ وہ سحرزدہ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اب کچھ گنگناتی تھی، فضا میں یک دم کوئی ساز بجنے لگا تھا۔ پہلے ایک۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ پھر بہت سارے۔ پوری کائنات یک دم جیسے کسی سمفنی میں ڈھل گئی تھی اور وہ اب بھی ہوا میں رقصاں تھی۔ کسی تمغیلیں پر کی طرح ہوا کے دوش پر اوپر نیچے جاتے، وہ سحرزدہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساٹھی رقص کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی، پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا یوں جیسے اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ وہ ہنس پڑا۔

”ہاتھ بڑھاتی اور وہ کھنچا نہ چلا آتا۔“

وہ بھی اس کا ہاتھ پکڑے اب فضا میں رقصاں تھا۔ زمین سے دور۔ اس کے قریب۔ اس کے ساتھ۔ یک دم وہ رکی، جیسے کائنات ٹھہر گئی ہو۔ وہ اب آسمان کو دیکھ رہی تھی پھر یک دم آسمان تاریک ہو گیا۔ دن رات میں

بدل گیا تھا۔ اور رات دن سے بڑھ کر خوبصورت تھی۔ سیاہ آسمان خوب صورت چمکتے ہوئے ستاروں سے سجا ہوا تھا۔ ہر رنگ کے ستاروں سے۔ اور ان سب کے درمیان چاند تھا۔ کسی داغ کے بغیر روشنی کا منبع۔ دن کی روشنی اجلی تھی۔ سکون آور تھی۔ سدھوش کر دینے والی تھی۔ رات کی روشنی میں بے شمار رنگ تھے، کائنات میں ایسے رنگ انہوں نے کب دیکھے تھے۔ کہاں دیکھے تھے۔ زمین جیسے ہر رنگ کی روشنی میں نہا رہی تھی۔ ایک ستارہ ٹمٹماتا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ اور زمین پر کبھی ایک رنگ بڑھتا، کبھی دوسرا، کبھی تیسرا۔ آسمان کو جیسے کسی نے روشنیوں میں پرو دیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے جیسے سرشاری کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی۔ اس کی حیرت اس کی سرشاری جیسے اسے مفلوظ کر رہی تھی۔ گدگدا رہی تھی۔

وہ اب پھر زمین پر آگئے تھے۔ رات ایک بار پھر دن میں بدل گئی تھی۔ سبز، پھول، پتے، مہکتی معطر ہوا، سب وہیں تھے۔

اس کے ساتھ چلتے چلتے اس نے اپنے پیروں کے نیچے آتے مٹلیں سبزے پر سجے پھولوں کو دیکھا پھر ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھ میں وہ پھول آگیا، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ پھر دور دور تک پھیلے سبزے کے سارے پھول جیسے کسی مقناطیس کی طرح اس کی طرف آئے تھے۔ سینکڑوں، ہزاروں لاکھوں۔ لاتعداد بے شمار آتے کہ اس کے ہاتھ سنبھال نہیں پائے تھے۔ وہ اب اس کے ہاتھوں پر۔ اب اس کے بالوں پر، اب اس کے لباس پر، اب اس کے جسم پر۔ وہ خوشی سے بے خود ہو رہی تھی، سرشار ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ہوا میں اچھالا۔ وہ پلک جھپکتے میں آسمان کی طرف گئے۔ پورا آسمان پھولوں سے بھر گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے پھر پھولوں کی بارش ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ پھولوں کو بارش کے قطروں کی طرح مٹھیوں میں بھرتے اور چھوڑتے بھاگتے، کھلکھلاتے وہ سب پھول زمین پر گر کر ایک بار پھر سبزے میں اپنی اپنی جگہ سج گئے تھے۔ وہاں جہاں وہ تھے۔ وہیں جہاں انہیں ہونا چاہیے تھا۔

وہ ایک بار پھر آسمان کو دیکھ رہے تھے وہاں اب بادل نظر آرہے تھے۔ روئی کے گالوں جیسے حرکت کرتے بادل۔ وہ سب بادل وہاں جمع ہو رہے تھے جہاں وہ کھڑے تھے۔ پھر اس نے آسمان پر بارش کا پہلا قطرہ دیکھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی ہتھیلی پر لیا۔ اس قطرے کو دیکھ کر دوبارہ ہنستے ہوئے آسمان کی طرف اچھال دیا۔ اس بار وہ قطرہ اوپر جا کر اکیلا واپس نہیں آیا تھا۔ وہ بہت سارے دوسرے قطروں کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ بہت سارے نرم لمس کے گدگدانے والے قطرے۔ بارش برس رہی تھی اور وہ دونوں بچوں کی طرح ہنستے، کھلکھلاتے پانی کے ان قطروں کو ہاتھوں سے پکڑ کر ایک دوسرے پر اچھال رہے تھے۔ وہ بارش بھی پانی تھا مگر وہ قطرے ان کے بالوں، ان کے جسم کو گیلیا نہیں کر رہے تھے۔ وہ جیسے شفاف موتیوں کی بارش تھی، جو ان کے ہاتھ اور جسم کی ایک جنبش پر ان کے بالوں اور لباس سے الگ ہو کر دور جا گرتے۔ سبزے اور پھولوں کے اوپر اب بارش کے شفاف موتی جیسے قطروں کی ایک تہہ سی آگئی تھی، یوں جیسے کسی نے زمین پر کوئی شیشہ پھیلا دیا ہو۔ اور وہ اس شیشے پر چل رہے تھے۔ ان کو اپنے سائے میں لیے وہ رکتے، ہاتھ ہلاتے، آسمان پر بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے پھر اپنی طرف بلا تے وہ آسمان پر جیسے پانی سے مصوری کر رہے تھے۔

پھر جیسے وہ اس کھیل سے تھک گئی۔ وہ رکی۔ بارش تھی۔ زمین سے پانی کے قطرے غائب ہونے لگے پھر بادل۔ چند ساعتوں میں آسمان صاف تھا۔ یوں جیسے وہاں کبھی بادل نام کی کوئی شے آئی ہی نہ ہو۔ وہ اب اس کا ہاتھ پکڑ رہا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”مہیں کچھ دکھانا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”کچھ اور بھی؟“ اس کی خوشی کچھ اور بڑھی۔

”ہاں، کچھ اور بھی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا؟“ اس نے بے ساختہ اس سے پوچھا تھا۔ وہ خاموشی سے مسکرا دیا۔

”کیا؟“ اس نے بچوں کی طرح اصرار کیا۔

وہ پہلے سے زیادہ پراسرار انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے اسی نئے راستے کی طرف جا رہا تھا۔

پھر ان دونوں کو دور سے کچھ نظر آنے لگا تھا۔



سالار نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ وہ فوری طور پر سمجھ نہیں سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کی سماعتوں نے دور کہیں کسی مسجد سے سحری کے آغاز کا اعلان سنا۔ اس کمرے کے گپ اندھیرے کو کھلی آنکھوں سے کھوجتے ہوئے اسے اگلا خیال اس خواب اور امامہ کا آیا تھا۔ وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا، جس سے وہ بیدار ہوا تھا۔

مگر خواب میں وہ امامہ کو کیا دکھانے والا تھا؟ اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ ”امامہ!“ اس کے دل کی دھڑکن جیسے ایک لمحے کے لیے رکی۔ وہ کہاں تھی؟ کیا پچھلی رات ایک خواب تھی؟

وہ یک دم جیسے کرنٹ کھا کر اٹھا۔ اپنی رکی سانس کے ساتھ اس نے دیوانہ وار اپنے بائیں جانب بیڈ ٹیبل لمپ کا سوچ آن کیا۔ کمرے کی تاریکی جیسے یک دم چھٹ گئی۔ اس نے برق رفتاری سے پلٹ کر اپنی دائیں جانب دیکھا اور پر سکون ہو گیا۔ اس کی رکی سانس چلنے لگی۔ وہ وہیں تھی۔ وہ ”ایک خواب“ سے کسی ”دوسرے خواب“ میں داخل نہیں ہوا تھا۔

یک دم آن ہونے والے بیڈ سائیڈ ٹیبل لمپ کی تیز روشنی چہرے پر پڑنے پر امامہ نے نیند میں بے اختیار اپنے ہاتھ اور بازو کی پشت سے اپنی آنکھوں اور چہرے کو ڈھک دیا۔

سالار نے پلٹ کر لمپ کی روشنی کو ہلکا کر دیا۔ وہ اسے جگانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔ گہری پرسکون نیند میں۔ اس کا ایک ہاتھ تنکے پر اس کے چہرے کے نیچے دیا ہوا تھا اور دوسرا اس وقت اس کی آنکھوں کو ڈھانے ہوئے تھا۔ اس کی اودھ کھلی ہتھیلی اور کلائی پر مہندی کے خوب صورت نقش و نگار تھے۔ مٹتے ہوئے نقش و نگار، لیکن اب بھی اس کے ہاتھوں اور کلائیوں کو خوب صورت بنائے ہوئے تھے۔

سالار کو یاد آیا، وہ مہندی کسی اور کے لیے لگائی گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آئی۔ اس نے بے اختیار چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں۔

کسی اور کے لیے؟

پچھلی ایک شام ایک بار پھر کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں گزر گئی تھی۔ اس نے سعیدہ اماں کے صحن میں اس چہرے کو نو سال کے بعد دیکھا تھا اور نو سال کہیں غائب ہو گئے تھے۔

وہ ذرا سا آگے جھکا اس نے بڑی نرمی سے اس کے ہاتھ کو اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل لمپ کی زرد روشنی میں اس سے چند انچ دور وہ اس پر جھکا، اسے مہسوت دیکھتا رہا۔ وہ گہرے سانس لیتی جیسے اسے زندگی دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ جیسے کسی طلسم میں پھنسا ہوا تھا۔ بے حد غیر محسوس انداز میں اس نے امامہ کے

چہرے پر آئے کچھ بالوں کو اپنی انگلیوں سے بڑی احتیاط سے ہٹایا۔

”میں لائٹ آف کر کے نہیں سو سکتا۔“ امامہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے سالار کو سونے سے پہلے لائٹ آف کرنے کے لیے کہا تھا۔

فوری طور پر امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ اگر وہ لائٹ آف کر کے نہیں سو سکتا تھا تو وہ لائٹ آن رکھ کر نہیں سو سکتی تھی لیکن وہ یہ بات اسے اتنی بے تکلفی سے نہیں کہہ سکتی تھی جتنے اطمینان سے وہ اسے کہہ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ الارم سیٹ کر کے سیل فون کو بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اسے دیکھ کر ٹھٹھکا۔ وہ کمبل پیٹے اسی طرح بیڈ پر بیٹھی جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔ یہ سالار کے گھر اس کی پہلی رات تھی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ اپنے بال پیٹتے ہوئے اپنا تکیہ سیدھا کرنے لگی۔

”تم شاید لائٹ آف کر کے سوئی ہو۔“ سالار کو اچانک خود ہی احساس ہو گیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹتے لیٹتے رک گئی۔

”ہمیشہ۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”پھر کچھ کرتے ہیں۔“ سالار نے بے ساختہ گہرا سانس لے کر سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے والے انداز میں کمرے کی لائٹس کا جائزہ لیا۔

”میں دیکھتا ہوں دو سرے بیڈ روم میں زیرو کا بلب ہے اگر وہ۔۔۔“ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ امامہ کے تاثرات سے اسے لگا کہ یہ حل بھی اس کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

”زیرو کے بلب کی کتنی روشنی ہوتی ہے!“ سالار نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھ کر کہا۔

”کمرے میں ٹھوڑی سی بھی روشنی ہو تو میں نہیں سو سکتی۔ میں ”اندھیرے“ میں سوئی ہوں۔“ اس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنا مسئلہ بتایا۔

”عجیب عادت ہے۔“ وہ بے ساختہ کہہ کر ہنسا۔

اس کی بات سے زیادہ اس کی ہنسی امامہ کو کھلی۔

”ٹھیک ہے لائٹ آن رہنے دو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں۔۔۔ نوپر اہلم میں اسے آف کر رہا ہوں۔“

دونوں بیک وقت اپنے اپنے موقف سے دست بردار ہوئے تھے۔

سالار نے لائٹ آف کر دی اور پھر سونے کے لیے خود بھی بستر پر لیٹ گیا لیکن وہ جانتا تھا یہ اس کے لیے مشکل ترین کام تھا۔ مارگلہ کی پہاڑی پر آٹھ سال پہلے گزار دی ہوئی اس ایک رات کے بعد وہ کبھی کمرے کی لائٹ بند کر کے نہیں سو سکتا تھا لیکن اس وقت اس نے مزید بحث نہیں کی۔ چند گھنٹوں کے بعد اسے دوبارہ سحری کے لیے اٹھ جانا تھا۔ وہ یہ چند گھنٹے بستر میں چپ چاپ لیٹ کر گزار سکتا تھا۔ ویسے بھی ”اندھیرا“ تھا پر آج رات وہ ”اکیلا“ نہیں تھا۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کا آغاز کیسے کریں۔ سالار کے لیے خاموشی کا یہ وقفہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔

تاریکی میں امامہ نے سالار کو گہرا سانس لے کر کہتے سنا۔

”اب اگر اتنی بڑی قربانی دے رہا ہوں میں لائٹ آف کر کے تو ”کوئی“ ہاتھ ہی پکڑ لے۔“ امامہ کو بے اختیار اس آئی۔ وہ اندھیرے میں اس کے کچھ قریب ہوئی اور سالار کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”تمہیں ڈر لگ رہا ہے کیا؟“ اس کے لمبے میں نرمی اور اپنائیت تھی۔

”اگر ہاں کہوں گا تو کیا کرو گی؟“ سالار نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔

”تسلیموں گی اور کیا کروں گی۔“ وہ مجبور ہوئی تھی۔

”جیسے اب دے رہی ہو؟“ اسے امامہ کو تنگ کرنے میں مزا آ رہا تھا لیکن یہ جملہ کہنے سے پہلے اس نے اپنے سینے پر دھرے اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کے متوقع جوابی عمل کو سالار سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ امامہ واقعی ہاتھ ہٹانے ہی والی تھی۔

”ڈر کیوں لگتا ہے تمہیں؟“ امامہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ڈر نہیں لگتا بس صرف سو نہیں سکتا۔“

”کیوں؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

وہ فوری جواب نہیں دے سکا۔ مارگلہ کی وہ رات سالار کی نظروں میں گھومنے لگی تھی۔ امامہ چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی پھر بولی۔

”بتانا نہیں چاہتے۔۔۔؟“ سالار کو حیرانی ہوئی۔ وہ کیسے اس کا ذہن پڑھ رہی تھی؟

”اور ایسا کب سے ہے؟“ امامہ نے اپنے سوال کو بدل دیا تھا۔

”آٹھ سال سے۔“ سالار نے جواب دیا۔

وہ مزید کوئی سوال نہیں کر سکی۔ اسے بھی بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔ آٹھ سال، آٹھ سال، وہ آٹھ سال سے اندھیرے سے خوف زدہ تھا۔ اور وہ نو سال سے روشنی سے خوف کھاتی پھر رہی تھی۔ دنیا سے چھٹی پھر رہی تھی۔

اس نے سالار سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ ایک دوسرے کے وجود میں پیوست کانٹوں کو نکالنے کے لیے ایک رات ناکافی تھی۔ وہ اب اس کے ہاتھ کی پشت کو جوم کر اسے اپنی ہند آنکھوں پر رکھ رہا تھا۔ امامہ بے اختیار رنجیدہ ہوئی۔

”میں لائٹ آن کر دیتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں۔۔۔ اندھیرا اچھا لگنے لگا ہے مجھے۔“ وہ اسی طرح اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے بیڑیا تھا۔

www.urdu novels pdf.com

بہت نرمی سے جھک کر اس نے امامہ کے چہرے کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ وہ اس سے باتیں کرتا کس وقت سویا تھا اسے اندازہ نہیں ہوا اور اب وہ جاگا تھا تو اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں سونا اتنا مشکل اور اتنا ہولناک ثابت نہیں ہوا تھا جتنا وہ سمجھتا رہا تھا۔

کمبل کو کچھ اوپر کھینچتے ہوئے اس نے اسے گردن تک ڈھانپ دیا اور پھر لمپ آف کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے بستر سے اٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے جاتے وہ اپنے سیل فون پر لگا الارم آف کر گیا۔

واش روم میں اس نے واش بیسن پر امامہ کے ہاتھ سے اتری کالج کی کچھ جوڑیاں اور اس کے ایررنگز دیکھے۔ اس نے ایررنگز اٹھا لیے۔ وہ دیر تک انہیں اپنے ہاتھ کی پتیلی پر رکھے دیکھتا رہا۔ وہ بہت خوب صورت تھے مگر اب ہانے ہو رہے تھے۔

جس وقت وہ نما کر رہا تھا وہ تب بھی گہری نیند میں تھی۔ کمرے کی لائٹ آن کے بغیر وہ دس ماؤں بند روم سے

باہر آگیا۔ بہت دور کسی مسجد میں کوئی نعت پڑھ رہا تھا یا صبح۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ سمجھنا مشکل تھا۔ اس نے سنگ ایڑیا کی لائٹ آن کر دی۔ لائٹ آن کرتے ہی اس کی نظر سینئر ٹیبل پر پڑے کافی کے دو بگڑے پر پڑی۔ وہ دونوں رات کو وہیں بیٹھے کافی پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے تھے۔ صوفے پر اس کی اپنی شال پڑی تھی جس میں وہ اپنے پاؤں چھپائے بیٹھی رہی تھی۔ رات ایک بار پھر جیسے کسی خواب کا قصہ لگنے لگی تھی۔ بے یقینی تھی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ خوش قسمتی تھی کہ اب بھی گمان بنی ہوئی تھی۔ وہ بھول گیا کہ وہ بیڈ روم سے یہاں کیا کرنے آیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ واقعی سب کچھ بھول گیا تھا۔ بس ”وہ“ تھی اور ”وہ“ تھی تو سب کچھ تھا۔

اس کے سیل پر آنے والی فرقان کی کلل نے یک دم اسے چونکایا تھا۔ کال ریسیو کیے بغیر وہ بیرونی دروازے کی طرف گیا۔ وہ اسے سحری دینے آیا تھا۔



اس کی آنکھ الارم کی آواز سے کھلی تھی۔ منہ می آنکھوں کے ساتھ اس نے لیٹے لیٹے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے اس الارم کو بند کرنے کی کوشش کی، لیکن الارم کلاک بند ہونے کے بجائے نیچے کا بٹن پر گر گیا۔ امامہ کی نیند یک دم غائب ہوئی تھی۔ الارم کی آواز جیسے اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ جھٹکرا تھی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر کے وہ کمر سے نکلی اور بے اختیار کپکپائی۔ سردی بہت تھی۔ اس نے کمر ہٹاتے ہوئے بیڈ کی پائلٹی کی طرف اپنی اوٹی شال ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے جھک کر کارپٹ پر دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ شال رات کو صوفے پر رکھی تھی، لیکن اس وقت وہ بیڈ روم سے نکلنے کی ہمت نہیں کر پائی۔ الارم اب بھی بج رہا تھا۔ مگر نظر اب بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس کی جھنجھلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ تب ہی اس نے اچانک کوئی خیال آنے پر سالار کے بستر کو دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ اسے جیسے یک دم یاد آیا کہ وہ ”کہاں“ تھی۔ جھنجھلاہٹ یک دم غائب ہوئی اور ساتھ ہی الارم کی آواز بھی۔ یہ سحری کا وقت تھا۔

امامہ سالار کے گھر پر تھی اور یہ اس کی نئی زندگی کا پہلا دن تھا۔

وہ دوبارہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کمر کے ایک کونے سے اس نے اپنے کندھے ڈھانچنے کی کوشش کی۔ اس کے جسم کی کپکپاہٹ کچھ کم ہوئی۔ اس نے پہلی بار اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چیزوں کو غور سے دیکھا۔ وہاں رات کو سالار نے گھڑی رکھی تھی۔ لیکن اب وہاں نہیں تھی۔ ایک چھوٹا رائٹنگ پیڈ اور پین بھی تھا۔ پاس ہی کارڈ لیس فون تھا۔ پانی کی ایک چھوٹی بوتل بھی وہیں تھی اور اس کے پاس اس کا سیل پڑا تھا۔ اسے ایک بار پھر الارم کلاک کا خیال آیا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے الارم نہیں لگایا تھا۔ یہ کام سالار کا تھا۔ شاید اس نے اپنے لیے الارم لگایا تھا۔ پھر جیسے اس کے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا۔ بیڈ کی وہ سائیڈ جو رات کو اس نے سونے کے لیے منتخب کی تھی، وہ سالار کا بستر تھا۔ وہ عادتاً ”وہ“ میں طرف گئی تھی اور سالار اسے روک نہیں سکا۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھی رہی، پھر اس نے بے حد ڈھیلے انداز میں اپنا سیل فون اٹھا کر ٹائم دیکھا اور جیسے کرنٹ کھا کر اس نے کمر لگایا۔ سحری ختم ہونے میں صرف دس منٹ باقی تھے اور سالار وہ الارم یقیناً ”اسے“ بیدار کرنے کے لیے لگا کر گیا تھا۔ اسے بے ساختہ غصہ آیا، وہ اسے خود بھی جگا سکتا تھا۔

جب تک وہ کپڑے تبدیل کر کے لاؤنج میں گئی، اس کا غصہ غائب ہو چکا تھا۔ کم از کم آج وہ اس سے خوش گوار موڈ میں ہی سامنا چاہتی تھی۔ سنگ ایڑیا کے ڈائننگ ٹیبل پر سحری کے لیے کھانا رکھا تھا۔ وہ بہت تیزی سے کچن میں کھانے کے برتن لینے کے لیے گئی تھی لیکن سنگ میں دو افراد کے استعمال شدہ برتن دیکھ کر اسے جیسے دھچکا لگا۔

وہ کھانا یقیناً ”فرقان“ کے گھر سے آیا تھا اور وہ فرقان کے ساتھ ہی کھا چکا تھا۔ اسے خواہ مخواہ خوش منہی ہوئی تھی کہ آج اس کے گھر میں پہلی سحری تو وہ ضرور اسی کے ساتھ کرے گا۔ بو جھل دل کے ساتھ ایک پلیٹ لے کر وہ ڈائننگ ٹیبل پر آگئی، لیکن چند لمحوں سے زیادہ نہیں لے سکی۔ اسے کم از کم آج اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ کھانا کھانا چاہیے تھا۔ امامہ کو واقعی بہت رنج ہوا تھا۔

چند لمحوں کے بعد ہی وہ بیڈ سے ٹیبل سے برتن اٹھانے لگی۔ برتن دھوتے دھوتے اذان ہونے لگی تھی جب اسے پہلی بار خیال آیا کہ سالار گھر میں نظر نہیں آ رہا۔ اپنے ہاتھ میں موجود پلیٹ دھوتے دھوتے وہ اسے اسی طرح سنگ میں چھوڑ کر باہر آگئی۔ اس نے سارے گھر میں دیکھا۔ وہ گھر میں نہیں تھا۔

پھر کچھ خیال آنے پر وہ بیرونی دروازے کی طرف آئی۔ دروازہ مقفل تھا لیکن ڈور چین ہٹی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً ”گھر پر نہیں تھا۔ کہاں تھا؟“ اس نے نہیں سوچا تھا۔

اس کی رنجیدگی میں اضافہ ہوا۔ وہ اس کی شادی کے دوسرے دن اسے گھر پر اکٹلا چھوڑ کر کتنی بے فکری سے غائب ہو گیا تھا۔ اسے پہلی رات کی ساری باتیں جھوٹ کا پلندہ لگی تھیں۔ واپس کچن میں آکر وہ کچھ دیر بے حد دل شکستگی کی کیفیت میں سنگ میں پڑے برتنوں کو دیکھتی رہی۔ وہ ”محبوبہ“ سے ”بیوی“ بن چکی تھی مگر اتنی جلدی تو نہیں۔ ناز برداری نہ سہی خیال تو کرنا چاہیے۔ اس کی آزدگی میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر کوئی استبدال سکتا ہے مگر رات کو تو وہ۔۔۔ ”اس کی رنجیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔

”یقیناً“ سب کچھ جھوٹ ہی کہہ رہا ہو گا ورنہ میرا کچھ تو خیال کرتا۔“ وہ رنجیدگی اب صدمے میں بدل رہی تھی۔

وہ نماز پڑھ چکی تھی اور سالار کا ابھی بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اسے تھوڑی سی تشویش ہوئی۔ اگر وہ فجر کی نماز کے لیے بھی گیا تھا تو اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔ پھر اس نے اس تشویش کو سر سے جھٹک دیا۔



سالار جس وقت دوبارہ اپارٹمنٹ میں آیا، وہ گہری نیند میں تھی۔ بیڈ روم کی لائٹ آف تھی اور ہیٹر آن تھا۔ وہ اور فرقان فجر کی نماز سے بہت دیر پہلے مسجد میں چلے جاتے اور قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد وہ دونوں وہیں سے بلڈنگ کے جم میں چلے جاتے اور تقریباً ”ایک گھنٹے کے ورک آؤٹ کے بعد وہاں سے آتے اور آج یہ دورانہ“ ”آمنہ“ کے امامہ ہونے کی وجہ سے کچھ لمبا ہو گیا تھا۔ فرقان سحری کے وقت ان دونوں کے لیے کھانا لے کر آیا تھا اور وہ بھونچکا بیٹھا رہ گیا تھا۔ وہ رات کو سالار کے جس بیان کو صدمے کی وجہ سے ذہنی حالت میں ہونے والی کسی خرابی کا نتیجہ سمجھ رہا تھا، وہ کوئی ذہنی خرابی نہیں تھی۔

وہ اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھا سحری کر رہا تھا اور فرقان اسے رشک سے دیکھ رہا تھا۔ رشک کے علاوہ کوئی اس پر کمر بھی کیا سکتا تھا۔

”کیا ہوا؟“ سالار نے سحری کرتے ہوئے اس کی اتنی لمبی خاموشی پر اسے کچھ حیرانی سے دیکھا۔ فرقان اس کے سامنے بیٹھا یک دم اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم آج اپنی نظر اتروانا۔“ فرقان نے بالآخر اس سے کہا۔

”چھائی؟“ وہ ہنس پڑا۔ اس سے زیادہ احمقانہ بات کم از کم اس گفتگو کے بعد کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا۔“ فرقان نے اپنے گلاس میں پانی اٹھالتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

جو کچھ ہوا تھا اسے سمجھنے سے زیادہ اسے ہضم کرنے میں اسے دقت ہو رہی تھی۔ کسی کو بھی ہو سکتی تھی۔ سوائے سامنے بیٹھے ہوئے اس شخص کے جو اس وقت کانٹے کے ساتھ آلیٹ کا آخری ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ رہا تھا۔

”اور اگر کوئی صدقہ وغیرہ دے سکو تو اور بھی بہتر ہے۔“ فرقان نے اس کے رد عمل کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ سالار اب بھی خاموش رہا۔

”آمنہ سحری نہیں کرے گی؟“ فرقان کو یکدم خیال آیا۔

”سورہی ہے وہ ابھی۔ میں الارم لگا آیا ہوں ابھی کافی وقت ہے سحری کا ٹائم ختم ہونے میں۔“ سالار نے کچھ لاپرواہی سے اس سے کہا۔

”فرقان! اب بس کرو۔“ اس سے بات کرتے کرتے وہ ایک بار پھر فرقان کی نظروں سے جھنجھلا یا۔ وہ پھر اسے ویسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”مجھے اس طرح آنکھیں پھاڑ کے دیکھنا بند کرو۔“ اس نے اس بار کچھ خفگی سے فرقان سے کہا۔

”تم۔ تم بہت نیک آدمی ہو سالار۔ اللہ تم سے بہت خوش ہے۔“ وہ آلیٹ کا ایک اور ٹکڑا لیتے لیتے فرقان کی بات پر لہٹک گیا۔

اس کی بھوک یکدم ختم ہو گئی تھی۔ مزید ایک لفظ کے بغیر اس نے پلیٹ پیچھے ہٹا دی اور اپنے برتن اٹھا کر اندر کچن میں لے گیا۔ وہ خوشی، سرشاری، اطمینان اور سکون جو کچھ دیر پہلے جیسے اس کے پورے وجود سے چھلک رہا تھا، فرقان نے بیک جھپکتے اسے دھواں بن کر غائب ہوتے دیکھا۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے فرقان نے بالآخر اس سے پوچھا تھا۔

”اتنے چپ کیوں ہو گئے ہو؟“ وہ اسی طرح خاموشی سے چلتا رہا۔

”میری کوئی بات بری لگی ہے؟“

وہ اب بھی خاموش رہا۔ مسجد کے دروازے پر اپنے جو گزاتار کر اندر جانے سے پہلے اس نے فرقان سے کہا۔

”مجھے تم سب کچھ کہہ لیتا فرقان۔ لیکن کبھی نیک آدمی مت کہنا۔“

فرقان کچھ بول نہیں سکا۔ سالار مسجد میں داخل ہو گیا تھا۔

امامہ کی آنکھ گیارہ بجے سیل فون پر آنے والی ایک کال سے کھلی تھی وہ ڈاکٹر سبط علی تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی اس کا دل بھر آیا تھا۔

”میں نے آپ کو نیند سے جگا دیا؟“

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولے۔ انہوں نے اس کی رندھی ہوئی آواز پر غور نہیں کیا تھا۔

”نہیں میں اٹھ گئی تھی۔“ اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے جھوٹ بولا۔

وہ اس کا حال احوال پوچھتے رہے۔ وہ بڑے بو جھل دل کے ساتھ تقریباً ”خالی الذہنی“ کے عالم میں ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔

چند منٹ اور بات کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔ کال ختم کرتے ہوئے اس کی نظر اپنے سیل فون میں جھپکتے اس کے نام پر پڑی تھی۔ وہ چونکا اٹھی اسے فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ اس نے سالار کا نام اور فون نمبر کب محفوظ کیا تھا۔ یقیناً ”یہ بھی اسی کا کارنامہ ہو گا۔ اس نے اس کا ایس ایم ایس پڑھنا شروع کیا۔

”پلیز جاگنے کے بعد مجھے میسج کرنا۔ مجھے ضروری بات کرنا ہے۔“ اسے نجانے کیوں اس کا میسج پڑھ کر فہمہ آیا۔

”بڑی جلدی یاد آگئی میں۔“ وہ میسج کا ٹائم چیک کرتے ہوئے بدردہائی۔ وہ شاید دس پچاس پر آیا تھا۔

”اگر آفس جاتے ہوئے اسے میں یاد نہیں آئی تو آفس میں بیٹھ کر کیسے آسکتی ہوں۔“ وہ اس وقت اس سے جی بھر کر بدگمان ہو رہی تھی اور شاید ٹھیک ہی ہو رہی تھی۔ وہ پچھلی رات اس کے لیے ”چیف گیسٹ“ تھی اور اگلی صبح وہ اس کے ساتھ بن پلائے مہمان جیسا سلوک کر رہا تھا۔ کم از کم امامہ اس وقت یہی محسوس کر رہی تھی وہ اس وقت وہ باتیں سوچ رہی تھی جو سالار کے وہ مہمان میں بھی نہیں تھیں۔

وہ کچھ عجیب انداز میں خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے کمرے میں تہہ کرتے ہوئے بستر ٹھیک کیا اور بیڈ روم سے باہر نکل آئی۔ ایئر ٹیمٹ کی خاموشی نے اس کی اداسی میں اضافہ کیا تھا۔ کھڑکیوں سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ کچن کے تنگ میں وہ برتن ویسے ہی موجود تھے جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

”ہاں وہ بھلا کیوں دھوتا یہ سارے کام تو ملازموں کے ہوتے ہیں۔ لیکن میں تو نہیں دھوؤں گی، چاہے ایک ہفتہ ہی پڑے رہیں۔ میں ملازمہ نہیں ہوں۔“ ان برتنوں کو دیکھ کر اس کی خفگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس وقت وہ ہر بات منفی انداز میں لے رہی تھی۔

وہ بیڈ روم میں آئی تو اس کا سیل فون بج رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کو خیال آیا کہ شاید سالار کی کال ہو، لیکن وہ مریم کی کال تھی۔ امامہ کا حال احوال پوچھنے کے بعد اس نے بڑے اشتیاق کے عالم میں امامہ سے پوچھا۔

”سالار نے منہ دکھائی میں کیا دیا تمہیں؟“ امامہ چند لمحے بول نہیں سکی۔ اس نے ٹوکلی تحفہ نہیں دیا تھا اسے سالار کے نامہ اعمال میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ امامہ نے کچھ دل شکستہ انداز میں کہا۔

”اچھا۔۔۔؟ چلو کوئی بات نہیں بعد میں دے دے گا شاید اسے خیال نہیں آیا۔“ مریم نے بات بدل دی تھی، لیکن اس کا آخری جملہ امامہ کو چھبھا۔ اسے خیال نہیں آیا۔ ہاں واقعی اسے خیال نہیں آیا ہو گا۔ وہ بے حد خفگی کے عالم میں سوچتی رہی۔

سالار سے اس کے گلے شکوے اس گھر میں آنے کے دو سرے دن ہی شروع ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ لاشعوری طور پر اس کی کال کی منتظر تھی۔ کہیں نہ کہیں اسے اب بھی امید تھی کہ وہ کم از کم دن میں ایک بار تو اسے کال کرے گا۔ کم از کم ایک بار۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ اسے میسج کر کے اسے اپنے ہونے کا احساس دلانا چاہیے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

وہ بے حد بے دلی سے اپنے کپڑے نکال کر نہانے کے لیے چلی گئی۔ واش روم سے باہر نکلتے ہی اس نے سب سے پہلے سیل فون چیک کیا تھا وہاں کوئی میسج تھا اور نہ کوئی مسئلہ کال۔

چند لمحے وہ سیل فون پکڑے بیٹھی رہی پھر اس نے اپنی ساری انا اور سارے غصے کو بلائے طاق رکھ کر اسے میسج کر دیا۔

اس کا خیال تھا وہ اسے فوراً ”کال کرے گا لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ پانچ منٹ۔ دس منٹ۔ پندرہ منٹ۔ اس نے اپنی انا کو کچھ اور مٹی کرتے ہوئے اسے میسج کیا۔ بعض دفعہ میسج پہنچتے بھی تو نہیں ہیں، اس نے اپنی عزت نفس کی ملامت سے بچنے کے لیے بے حد کمزور تاویل تلاش کی۔

”آج کل ویسے بھی میٹورک اور سکنلز کا اتنا زیادہ مسئلہ ہے۔“

”عزت نفس“ نے اسے جواباً ”ڈوب مرنے کے لیے کہا تھا۔ فون اب بھی نہیں آیا تھا، لہٰذا بریک کے باوجود وہ

رمضان نہ ہوتا تو شاید وہ اس وقت اپنی "عزت نفس" کو اس کے بچ میں مصروف ہونے کا بہانہ پیش کرتی۔
اب وہ واقعی ناخوش تھی بلکہ ناخوش سے بھی زیادہ اب اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔
کچھ دیر بعد اس نے سالار کے سیل پر کال کی۔ دوپہار کے بعد کال کسی لڑکی نے ریسپونڈ کی۔ ایک لمحے کے لیے
امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ سالار کے بجائے کسی لڑکی کی آواز کی توقع نہیں کر رہی تھی۔
"میں آپ کی کیا ہیلپ کر سکتی ہوں میم؟" لڑکی نے بڑی شائستگی کے ساتھ اس سے پوچھا۔
"مجھے سالار سے بات کرنی ہے۔" اس نے کچھ تذبذب سے کہا۔

"سالار سکندر صاحب تو ایک میننگ میں ہیں۔ اگر آپ کوئی کلائٹ ہیں اور آپ کو بینک سے متعلقہ کوئی کام
ہے تو میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں یا آپ میسج چھوڑ دیں ان کے لیے۔ میننگ میں بریک آئے گی تو میں انہیں
انفارم کر دوں گی۔" اس لڑکی نے بے حد پروفیشنل انداز میں کہا۔ امامہ خاموش رہی۔
"ہیلو۔۔۔ مس امامہ!" اس لڑکی نے یقیناً "سالار کے سیل پر اس کی آئی ڈی پڑھ کر اس کا نام لیا تھا۔ وہ اب اسے
متوجہ کر رہی تھی۔

"میں بعد میں کال کر لوں گی۔" اس نے بددلی کے ساتھ فون بند کر دیا۔
"تو وہ میننگ میں ہے اور اس کا سیل تک اس کے پاس نہیں۔۔۔ اور مجھے کہہ رہا تھا کہ میں جاگنے کے بعد اسے
انفارم کر دوں۔۔۔ کس لیے؟" وہ دل برداشتہ ہو گئی تھی۔

"ارے بیٹا! میں تو کب سے تمہارے فون کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ تمہیں اب یاد آئی سعیدہ اماں کی۔"
سعیدہ اماں نے اس کی آواز سنتے ہی گلہ کیا۔
اس نے جواباً "بے حد کمزور بہانے پیش کیے۔ سعیدہ اماں نے اس کی وضاحتوں پر غور نہیں کیا۔
"سالار ٹھیک تو ہے نا تمہارے ساتھ؟"

انہوں نے اس سوال کے مضمرات کا اس صورت حال میں سوچے بغیر پوچھا اور امامہ کے صبر کا جیسے بیگانہ لہریز
ہو گیا تھا۔ وہ یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ سعیدہ اماں بری طرح گھبرا گئی تھیں۔
"کیا ہوا بیٹا؟۔۔۔ ارے اس طرح کیوں رو رہی ہو۔۔۔؟ میرا تو دل گھبرائے لگا ہے۔ کیا ہو گیا آمنہ؟" سعیدہ اماں
کو جیسے ٹھنڈے سینے آنے لگے تھے۔

"سالار نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟" سعیدہ اماں کو سب سے پہلا خیال یہی آیا تھا۔
"مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" امامہ نے ان کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا۔
سعیدہ اماں کی حواس باختگی میں اضافہ ہوا۔
"میں نے کہا بھی تھا آپ سے۔" وہ روتی جا رہی تھی۔
"کیا وہ اپنی پہلی بیوی کی باتیں کرتا رہا ہے تم سے؟"

سعیدہ اماں نے سالار کے حوالے سے لاحقہ خدشے کا بے اختیار ذکر کیا۔
"پہلی بیوی۔۔۔؟" امامہ نے روتے روتے کچھ حیرانی سے سوچا۔
لیکن سالار کے لیے اس وقت اس کے دل میں اتنا غصہ بھرا ہوا تھا کہ اس نے بلا سوچے سمجھے سعیدہ اماں کے
خدشے کی تصدیق کی تھی۔
"جی۔۔۔ اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

سعیدہ اماں کے سینے پر جیسے کھوسا لگا۔ یہ خدشہ تو انہیں تھا لیکن ان کا خیال تھا کہ اپنے گھر لے جاتے ہی پہلے
دن تو وہ کم از کم اپنی اس کٹی سال پر اپنی منکوحہ کا ذکر نہیں کرے گا۔ امامہ کو سالار پر کیا غصہ آتا تھا جو سعیدہ اماں کو آیا
تھا انہیں ایک دم پچھتاوا ہوا تھا۔ واقعی کیا ضرورت تھی یوں راہ چلتے کسی بھی دوست کے آدمی کو پکڑ کر یوں اس کی
شادی کر دینے کی۔ انہوں نے پچھتاتے ہوئے سوچا۔

"تم فکر نہ کرو۔۔۔ میں خود سب علی بھائی سے بات کر دوں گی۔" سعیدہ اماں نے بے حد غصے میں کہا۔
"کوئی فائدہ نہیں اماں! بس میری قسمت ہی خراب ہے۔"

سعیدہ اماں کے پاس آنے والی عورتوں کے منہ سے کئی بار سنا ہوا گھسا پٹا جملہ کس طرح اس کی زبان پر آ گیا اس
کا اندازہ امامہ کو نہیں ہوا لیکن اس جملے نے سعیدہ اماں کے دل پر جیسے آری چلا دی۔
"ارے کیوں قسمت خراب ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں رہنے کی۔ تم ابھی آ جاؤ اس کے گھر سے۔۔۔
ارے میری معصوم بچی پر اتنا ظلم۔ ہم نے کوئی جہنم میں تھوڑا پھینکا ہے نہیں۔"
امامہ کو ان کی باتوں پر اور رونا آیا۔ خود ترسی کا اگر کوئی ماؤنٹ ایورسٹ ہوتا تو وہ اس وقت اس کی چوٹی پر جھنڈا
گاڑ کر بیٹھی ہوتی۔

"بس! تم ابھی رکشہ لو اور میری طرف آ جاؤ۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ادھر بیٹھے رہنے کی۔"
سعیدہ اماں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

یہ گفتگو مزید جاری رہتی تو شاید امامہ بغیر سوچے سمجھے روتے ہوئے اسی طرح وہاں سے چل بھی پڑتی۔ وہ اس
وقت کچھ اتنی ہی جذباتی ہو رہی تھی لیکن سالار کے ستاروں کی گردش اس دن صرف چند لمحوں کے لیے اچھی
ثابت ہوئی۔ سعیدہ اماں سے بات کرتے کرتے کال کٹ گئی تھی اس کا کریڈٹ ختم ہو گیا تھا۔ امامہ نے لینڈ لائن
سے کال کرنے کی کوشش کی لیکن کال نہیں ملی۔ شاید سعیدہ اماں نے فون کارڈ ریسور کریڈٹ پر ٹھیک سے نہیں رکھا
تھا۔ وہ بری طرح جھنجھلائی۔

سعیدہ اماں سے بات کرتے ہوئے وہ اتنی دیر میں پہلی بار بہت اچھا محسوس کر رہی تھی یوں جیسے کسی نے اس
کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہو۔ اسے اس وقت جس "متعصب" جانب داری کی ضرورت تھی انہوں نے اسے وہی
دی تھی۔ ان سے بات کرتے ہوئے روانی اور فراوانی سے بننے والے آنسو اب یکدم خشک ہو گئے تھے۔

وہاں سے دس میل کے فاصلے پر اپنے بینک کے بورڈ روم میں بیٹھی ایوبیلویشن ٹیم کو دی جانے والی پریزنٹیشن
کے اختتامیہ سوال و جواب کے سیشن میں کرڈ بلسٹی اینڈ ٹرسٹ فیکٹر سے متعلقہ کسی سوال کے جواب میں بولتے
ہوئے سالار کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر پر موجود اس کی ایک دن کی بیوی اور نو سالہ "محبوبہ" گھر پر بیٹھی
اس کی "ساکھ" اور "نام" کا تیاپانچہ کرنے میں مصروف تھی۔ جس کو اس وقت اس وضاحت کی اس ایوبیلویشن ٹیم
سے زیادہ ضرورت تھی۔

سونا ہو گیا۔۔۔ رونا بھی ہو گیا۔۔۔ اب اور کیا رہ گیا تھا۔۔۔ امامہ نے نشوونما سے آنکھیں اور ناک رگڑتے ہوئے
بالآخر ریسور رکھتے ہوئے سوچا۔ اسے کچن کے سنک میں پڑے برتنوں کا خیال آیا بڑی سیم دلی سے وہ کچن میں گئی
اور ان برتنوں کو دھونے لگی۔

وہ شام کے لیے اپنے کپڑے نکالنے کے لیے ایک بار پھر بیڈ روم میں آ گئی اور تب ہی اس نے اپنا سیل فون بجتے
ہلکا۔ جب تک وہ فون کے پاس پہنچی فون بند ہو چکا تھا۔ وہ سالار تھا اور اس کے سیل پر یہ اس کی چوتھی مسلسل کال
تھی۔ وہ سیل ہاتھ میں لیے اس کی اگلی کال کا انتظار کرنے لگی۔ کال کے بجائے اس کا میسج آیا۔ وہ اسے اپنے
گھر کرام میں تبدیلی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر سبط علی کا ڈاکٹر اب ایک گھنٹے تک اسے وہاں سے ڈاکٹر صاحب

کے گھر لے جائے گا اور وہ افطار کے بعد آفس سے سیدھا ڈاکٹر صاحب کے گھر آئے والا تھا۔

چند لمحوں کے لیے اس کا دل چاہا وہ فون کو دیو اور پردے مارے لیکن وہ اس کا اپنا فون تھا۔ سالار کو کیا فرق پڑتا۔ وہ اس سے رات کو اتنا لمبا چوڑا اظہار محبت نہ کرتا تو وہ آج اس سے توقعات کا یہ انبار لگا کر نہ بیٹھی ہوئی لیکن سالار کے ہر جملے پر اس نے لاشعوری طور پر پچھلی رات اپنے دامن کے ساتھ ایک گرہ باندھ لی تھی اور گرہوں سے بھر دامن اب اسے بری طرح تنگ کرنے لگا تھا۔

ڈاکٹر سبط علی گھر پر نہیں تھے۔ آنٹی کلثوم نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور وہ بھی جس حد تک مصنوعی جوش و خروش اور اطمینان کا مظاہرہ کر سکتی تھی کرتی رہی۔ آنٹی کے منع کرنے کے باوجود وہ ان کے ساتھ مل کر افطار اور ڈنر کی تیاری کرواتی رہی۔

ڈاکٹر سبط علی افطار سے کچھ دیر پہلے آئے تھے۔ اور انہوں نے امامہ کی سنجیدگی نوٹ کی تھی۔ مگر اس کی سنجیدگی کا تعلق سالار سے نہیں جوڑا تھا۔ وہ جوڑ بھی کیسے سکتے تھے۔ سالار افطار کے تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد آیا تھا۔

اور امامہ سے پہلی نظر ملتے ہی سالار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اس کی خیر مقدمی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرائی تھی نہ ہی اس نے ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی کی طرح گرم جوشی سے اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ وہ بس نظریں چرا کر لاؤنج سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے سالار کو لگا کہ شاید اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ آخر وہ اس سے کس بات پر ناراض ہو سکتی ہے۔

وہ ڈاکٹر سبط علی کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کرتا ہوا اپنے ذہن میں پچھلے چوبیس گھنٹوں کے واقعات کو دہراتا اور کوئی ایسی بات ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا جو امامہ کو خفا کر سکتی تھی۔ اسے ایسی کوئی بات یاد نہیں آئی۔ ان کے درمیان آخری گفتگو رات کو ہوئی تھی۔ وہ اس کے بازو پر سر رکھے باتیں کرتی سوئی تھی۔ خفا ہوئی تو۔۔۔ وہ الجھ رہا تھا۔

”کم از کم میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو اسے برا لگا ہو شاید یہاں کوئی ایسی بات ہوئی ہو۔“ سالار نے خود کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے سوچا۔ ”لیکن یہاں کیا بات ہوئی ہوگی۔۔۔؟ شاید میں کچھ ضرورت سے زیادہ حساس ہو کر سوچ رہا ہوں غلط فہمی ہو سکتی ہے مجھے۔“

وہ اب خود کو تسلی دے رہا تھا لیکن اس کی چھٹی حس اسے اب بھی اشارہ دے رہی تھی۔ بے شک وہ اس سے نو سال بعد ملا تھا مگر نو سال پہلے دیکھے جانے والا اس کا ہر موڈ اس کے ذہن پر رجسٹرڈ تھا اور وہ امامہ کے اس موڈ کو بھی جانتا تھا۔

ڈنر ٹیبل پر بھی زیادہ تر گفتگو ڈاکٹر سبط علی اور سالار کے درمیان ہی ہوئی۔ وہ آنٹی کے ساتھ وقفے وقفے سے سب کو ڈشیز سرو کرتی رہی خاموشی اب بھی برقرار تھی۔

وہ ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ مسجد میں تراویح پڑھنے آیا اور حفظ قرآن کے بعد آج پہلی بار تراویح کے دوران انکا۔ ایک بار نہیں دوبارہ۔ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن وہ بار بار ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

وہ ساڑھے دس بجے کے قریب ڈاکٹر سبط علی کے گھر سے سعیدہ اماں کے گھر جانے کے لیے نکلے تھے اور سالار نے بالآخر اس سے پوچھ ہی لیا۔

”تم مجھ سے خفا ہو؟“

کھڑکی سے باہر دیکھتے وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر اس نے کہا۔

”میں تم سے کیوں خفا ہوں گی؟“ وہ بدستور کھڑکی کی طرف گردن موڑے باہر دیکھ رہی تھی۔ سالار کچھ مطمئن

ہوا۔

”ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی جس پر تمہارا موڈ آف ہوتا۔“ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امامہ نے اس کی بات سنی اور اس کی ہر ہی کچھ اور بڑھی۔

”یعنی میں عقل سے پیدل ہوں جو بلا وجہ اپنا موڈ آف کرتی پھر رہی ہوں۔۔۔ اور اس نے میرے رویے اور حرکتوں کا نوٹس ہی نہیں لیا۔“

”میں تمہیں آج فون کرتا رہا لیکن تم نے فون ہی نہیں اٹھایا۔“ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ امامہ کو سوچتے ہوئے عجیب سی تسلی ہوئی۔

”چھا ہوا نہیں اٹھایا یعنی اس نے محسوس تو کیا کہ میں جان بوجھ کر اس کی کال نہیں لیتی رہی۔“

”پھر میں نے گھر کے نمبر پر فون کیا۔ وہ بھی انکے جملہ تھا تم یقیناً اس وقت مصروف تھیں اس لیے کال نہیں لے سکیں۔“ وہ بے حد عام سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہاں بے نیازی کی انتہا تھی۔

امامہ کے رنج میں اضافہ ہوا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کے فون کا بیلنس ختم ہو چکا تھا۔

”مجھے اپنے فون کے لیے کارڈ خریدنا ہے۔“

سالار نے اسے یک دم کہتے سنا، وہ اپنا ہینڈ بیگ کھولے اس میں سے کچھ نکال رہی تھی اور جو چیز اس نے نکال کر سالار کو پیش کی تھی اس نے چند لمحوں کے لیے سالار کو ساکت کر دیا تھا۔ وہ ہزار روپے کا ایک نوٹ تھا۔ وہ اس کے تاثرات سے بے خبر ابونڈ سکرین سے باہر کسی ایسی شاپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی جہاں پر وہ کارڈ دستیاب ہوتے۔ سالار نے اپنی طرف بڑھے ہوئے اس کے ہاتھ کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”واپسی پر لیتے ہیں۔۔۔ اور اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تمہیں آنکھیں بند کر کے اپنا سیل فون تھما دیا تھا جب تم میری کچھ نہیں تھیں تو اب کیا پیسے لوں گا تم سے؟“

گاڑی میں کچھ عجیب سی خاموشی در آئی تھی۔ دونوں کو بیک وقت کچھ یاد آیا تھا اور جو یاد آیا تھا اس نے یک دم وقت کو وہیں روک دیا تھا۔

بہت غیر محسوس انداز میں امامہ نے ہاتھ میں پکڑے کانڈ کے اس کٹڑے کو بہت سی تہوں میں لپیٹنا شروع کر دیا۔ اس نے اس کی ساری رقم لوٹا دی تھی بلکہ اس سے زیادہ ہی جتنی اس نے فون فون کے بل اور اس کے لیے خرچ کی ہوگی۔ مگر احسان۔۔۔ یقیناً اس کے احسانوں کا وزن بہت زیادہ تھا۔ اس نے کانڈ کی لپٹی تہوں کو دوبارہ بیگ میں ڈال لیا۔ صبح سے اکٹھی کی ہوئی بدگمانیوں کی دھند یکدم چھٹ گئی تھی یا کچھ دیر کے لیے امامہ کو ایسا ہی محسوس ہوا۔

باہر سڑک پر دھند تھی اور وہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ امامہ کا دل چاہا وہ اس سے کچھ بات کرے لیکن وہ خاموش تھا۔ شاید کچھ سوچ رہا تھا یا لفظ ڈھونڈ رہا تھا۔

”آج سارا دن کیا کرتی رہیں تم؟“

اس نے بالآخر گفتگو کا دوبارہ آغاز کرنے کی کوشش کی تھی۔ پورا دن فلیش کی طرح امامہ کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ امامہ کو ندامت ہوئی وہ جو کچھ کرتی رہی تھی اسے جتنا نہیں سکتی تھی۔

”میں سوئی رہی۔“ اس نے پورے دن کو تین لفظوں میں سمیٹ دیا۔

”ہاں مجھے اندازہ تھا جاگ رہی ہو تیں تو میری کال ضرور ریسیو کرتیں۔“ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

”پاپا، مئی اور انیتا آرہے ہیں کل شام۔“ سالار نے کچھ دیر کے بعد کہا۔
امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تم سے ملنے کے لیے؟“ اس نے مزید اضافہ کیا اور بالآخر سسرال کے ساتھ اس کا پہلا رابطہ ہونے والا تھا۔
امامہ کو اپنے پیٹ میں گرہیں لگتی محسوس ہوئیں۔

”تم نے انہیں میرے بارے میں بتایا ہے؟“ اس نے بے حد نپے تلے الفاظ میں پوچھا۔
”نہیں، فی الحال نہیں، لیکن آج جاؤں گا یا کو فون پر۔“ وہ ہنسنے سے باز نہ رہا۔
امامہ نے اس کے چہرے کو بڑھنے کی کوشش کی۔ کوئی پریشانی، تشویش، اندیشہ، خدشہ، خوف، پچھتاوا۔ وہ کچھ بھی پڑھنے میں ناکام رہی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور اگر اس کے دل میں کچھ تھا بھی تو وہ اسے بڑی مہارت سے چھپائے ہوئے تھا۔

سالار نے اس کی کھوجتی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ اس نے امامہ کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ امامہ نے بے اختیار نظریں ہٹائیں۔

”انیتا کی فلائٹ ساڑھے پانچ بجے اور پاپا کی سہ ماہی سے جلدی ایئر پورٹ چلا جاؤں گا“
پھر مئی اور پاپا کو لے کر میرا خیال ہے نو یا ساڑھے نو بجے تک گھر پہنچوں گا۔“

”یہ تم نے کیا ہنسا ہوا ہے؟“ سالار نے یکدم اس کے لباس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
تین گھنٹے پہنچنا تیس منٹ کے بعد بالآخر اسے یاد آگیا کہ میں نے کچھ ہنسا ہوا ہے۔ یہ سوچ کر امامہ کی خفگی میں کچھ اضافہ ہوا۔

”کپڑے۔“ امامہ نے جواب دیا۔
سالار اس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔ ”جانتا ہوں کپڑے پہنے ہیں اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔“

امامہ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی کہ اب وہ تعریف کرے گا۔ اس نے سوچا۔ دیر سے سہی، لیکن اسے میرے کپڑے نظر تو آئے۔ اس کی خفگی میں کچھ اور کمی ہوئی۔

”کون سا کپڑا ہے؟“ سالار نے اپنے پیروں پر پہلی کھانسی ماری۔
کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امامہ کا دل چاہا وہ چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کود جائے۔ پونے چار گھنٹے میں وہ اس کے کپڑوں کا رنگ بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے اسے غور سے دیکھا نہیں تھا۔

”پتا نہیں۔“ اس نے اسی طرح کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بے حد سرد مہری سے کہا۔
”ہاں میں بھی اندازہ نہیں کر سکا۔ آج کل خواتین پہنتی بھی تو بڑے عجیب عجیب کپڑے ہیں۔“ سالار نے اس کے لمبے پر غور کیے بغیر عام سے انداز میں کہا۔

وہ زنگ اور کاپر کے سب سے زیادہ ان شید کو ”عجیب“ کہہ رہا تھا۔ امامہ کو رنج سارنچ ہوا۔ سالار شوہروں کی تاریخی غلطیاں دہرا رہا تھا۔ اس بار امامہ کا دل تک نہیں چاہا کہ وہ اس کی بات کا جواب دے وہ اس قابل نہیں تھا۔

اسے یاد آیا اس نے کل بھی اس کے کپڑوں کی تعریف نہیں کی تھی۔ کپڑے۔؟ اس نے تو اس کی بھی تعریف نہیں کی تھی۔ اظہار محبت کیا تھا اس نے۔ لیکن تعریف۔ ہاں تعریف تو نہیں کی تھی اس نے۔ وہ جیسے پچھلی رات کو یاد کرتے ہوئے تصدیق کر رہی تھی اسے دکھ ہوا۔ کیا وہ اسے اتنی بھی خوب صورت نہیں لگی تھی کہ وہ ایک بار ہی کہہ دیتا۔ کوئی ایک جملہ، ”ایک لفظ کچھ بھی نہیں“ وہ ایک بار پھر خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ عورت اظہار محبت اور ستائش کو کبھی ”ہم معنی“ نہیں سمجھتی۔ یہ کام مرد کرتا ہے اور غلط کرتا ہے۔

وہ رات کو یاد کرتے ہوئے تصدیق کر رہی تھی اسے دکھ ہوا۔ کیا وہ اسے اتنی بھی خوب صورت نہیں لگی تھی کہ وہ ایک بار ہی کہہ دیتا۔ کوئی ایک جملہ، ”ایک لفظ کچھ بھی نہیں“ وہ ایک بار پھر خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ عورت اظہار محبت اور ستائش کو کبھی ”ہم معنی“ نہیں سمجھتی۔ یہ کام مرد کرتا ہے اور غلط کرتا ہے۔

وہ رات کو یاد کرتے ہوئے تصدیق کر رہی تھی اسے دکھ ہوا۔ کیا وہ اسے اتنی بھی خوب صورت نہیں لگی تھی کہ وہ ایک بار ہی کہہ دیتا۔ کوئی ایک جملہ، ”ایک لفظ کچھ بھی نہیں“ وہ ایک بار پھر خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ عورت اظہار محبت اور ستائش کو کبھی ”ہم معنی“ نہیں سمجھتی۔ یہ کام مرد کرتا ہے اور غلط کرتا ہے۔

وہ رات کو یاد کرتے ہوئے تصدیق کر رہی تھی اسے دکھ ہوا۔ کیا وہ اسے اتنی بھی خوب صورت نہیں لگی تھی کہ وہ ایک بار ہی کہہ دیتا۔ کوئی ایک جملہ، ”ایک لفظ کچھ بھی نہیں“ وہ ایک بار پھر خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ عورت اظہار محبت اور ستائش کو کبھی ”ہم معنی“ نہیں سمجھتی۔ یہ کام مرد کرتا ہے اور غلط کرتا ہے۔

کے اس نے کس قدر سنگین موضوع کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے جیسے ایک ہارودی سرنک کے اوپر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا جو اس کے پاؤں اٹھاتے ہی بچھٹ جاتی۔

سعیدہ اماں کی کھلی میں گاڑی پارک کرنے کے بعد سالار نے ایک بار پھر امامہ کے موڈ میں تبدیلی محسوس کی۔ اس نے ایک بار پھر اسے اپنا وہم گردانا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر سبط علی کے گھر۔ بھی غلط فہمی کا شکار رہا۔ آخر وہ کیا کیا ہے مجھے۔؟ وہ بھلا کیوں صرف چوبیس گھنٹے میں مجھ سے ناراض ہوتی پھرے گی۔ اس نے اطمینان سے کہا۔

سعیدہ اماں دروازہ کھولتے ہی امامہ سے لپٹ گئی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ آنسو بہا رہی تھیں۔ سالار جزبہ ہوا۔ آواز اتنے عرصے سے وہ اکٹھے رہ رہی تھیں۔ یقیناً ”دونوں ایک دوسرے کو مس کر رہی ہوں گی۔ اس نے بالآخر خود کو سمجھایا۔

سعیدہ اماں نے سالار کے سلام کا جواب دیا نہ ہی پیشہ کی طرح اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ انہوں نے امامہ کو گلے لگایا۔ اس سے لپٹ کر آنسو بہائے اور پھر اسے لے کر اندر چلی گئیں۔ وہ بکا بکا دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا تھا۔

البتہ کیا ہوا؟ وہ پہلی بار بری طرح کھٹکا تھا۔ اسے احساس کو وہم سمجھ کر جھٹکنے کی کوشش اس بار کامیاب نہیں ہوئی۔ کچھ غلط تھا مگر کیا۔؟ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر اس نے لپٹ کر بیرونی دروازہ بند کیا اور اندر چلا آیا۔

وہ دونوں کچھ باتیں کر رہی تھیں اسے دیکھ کر یکدم چپ ہو گئیں۔ سالار نے امامہ کو اپنے آنسو پونچھتے دیکھا۔ وہ ایک بار پھر شرب ہوا۔

”میں چائے لے کر آتی ہوں۔ بادام اور گاجر کا حلوہ بنایا ہے آج میں نے۔“ سعیدہ اماں یہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔ سالار نے بے اختیار انہیں ٹوکا۔

”سعیدہ اماں! کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے ہم لوگ کھانا کھا کر آئے ہیں اور چائے بھی پی لی ہے۔ صرف آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔“

وہ کہتے کہتے رک گیا اسے احساس ہوا کہ وہ پیشکش سرے سے اسے کی ہی نہیں گئی تھی۔ سعیدہ اماں مکمل طور پر امامہ کی طرف متوجہ تھیں اور امامہ اسے کچھ کھانے پینے میں متامل نظر نہیں آئی۔

”میں کھاؤں گی اور میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں آپ کس طرح اٹھائیں گی برتن۔“ امامہ نے سعیدہ اماں سے کہا اور پھر ان کے ساتھ ہی کچن میں چلی گئی۔ سالار ہونٹوں کی طرح وہاں بیٹھا رہ گیا۔

گلے بندہ مشہور اس صورت حال پر غور کرتا وہیں بیٹھا کمرے کی چیزوں کو دیکھتا رہا۔ بالآخر بندہ منٹ کے بعد امامہ اور سعیدہ اماں کی واپسی ہوئی۔ اسے امامہ کی آنکھیں پہلے سے کچھ زیادہ سرخ اور متورم لگیں یہی حال کچھ اس کی ناک کا تھا۔ وہ یقیناً ”کچن میں روتی رہی تھی مگر کس لیے؟ وہ اب الجھ رہا تھا۔ کم از کم اب وہ آنسو اسے سعیدہ اماں اور اس کی باہمی محبت و یگانگت کا نتیجہ نہیں لگ رہے تھے۔ سعیدہ اماں کے چہرے اور آنکھوں میں اسے پہلے سے بھی زیادہ سرد مہری نظر آئی۔

اسے اس وقت چائے میں دلچسپی تھی نہ کسی حلوے کی طلب۔ کچھ بھی کھانا اس کے لیے بد قسمتی کا باعث ہوتا لیکن جو ماحول یک دم وہاں بن گیا تھا اس نے اسے ضرورت سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ کسی انکار کے بغیر اس نے خاموشی سے پلیٹ میں تھوڑا سا حلوہ نکالا۔ امامہ نے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی طرح یہاں بھی اس سے پوچھے بغیر اس کی چائے میں دو چمچ چینی ڈال کر اس کے سامنے رکھ دی، پھر اپنی پلیٹ میں لیا حلوہ کھانے لگی۔

چند منٹوں کی خاموشی کے بعد بالآخر سعیدہ اماں کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی عینک کو ناک پر ٹھیک کرتے ہوئے تیز نظروں سے سالار کو گھورا۔

اسے اس وقت چائے میں دلچسپی تھی نہ کسی حلوے کی طلب۔ کچھ بھی کھانا اس کے لیے بد قسمتی کا باعث ہوتا لیکن جو ماحول یک دم وہاں بن گیا تھا اس نے اسے ضرورت سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ کسی انکار کے بغیر اس نے خاموشی سے پلیٹ میں تھوڑا سا حلوہ نکالا۔ امامہ نے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی طرح یہاں بھی اس سے پوچھے بغیر اس کی چائے میں دو چمچ چینی ڈال کر اس کے سامنے رکھ دی، پھر اپنی پلیٹ میں لیا حلوہ کھانے لگی۔

چند منٹوں کی خاموشی کے بعد بالآخر سعیدہ اماں کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی عینک کو ناک پر ٹھیک کرتے ہوئے تیز نظروں سے سالار کو گھورا۔

اسے اس وقت چائے میں دلچسپی تھی نہ کسی حلوے کی طلب۔ کچھ بھی کھانا اس کے لیے بد قسمتی کا باعث ہوتا لیکن جو ماحول یک دم وہاں بن گیا تھا اس نے اسے ضرورت سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ کسی انکار کے بغیر اس نے خاموشی سے پلیٹ میں تھوڑا سا حلوہ نکالا۔ امامہ نے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی طرح یہاں بھی اس سے پوچھے بغیر اس کی چائے میں دو چمچ چینی ڈال کر اس کے سامنے رکھ دی، پھر اپنی پلیٹ میں لیا حلوہ کھانے لگی۔

چند منٹوں کی خاموشی کے بعد بالآخر سعیدہ اماں کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی عینک کو ناک پر ٹھیک کرتے ہوئے تیز نظروں سے سالار کو گھورا۔

”بیویوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔“

اپنی پلیٹ میں ڈالے حلوے کو چبھتے سے ہلاتے سالار لہٹھکا۔ اس نے پہلے سعیدہ اماں کو دیکھا پھر امامہ کو۔ وہ بھی لہٹھکی تھی۔ اور کچھ گڑبائی بھی۔ سالار کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی اور اس کے گلے شکوے کرنا اور بات بھی مکر اس کے سامنے بیٹھ کر وہی کچھ دہرانا خاص طور پر جب ان الزامات کا کچھ حصہ کسی جھوٹ پر مبنی ہو۔ وہ واقعی گھبرا گئی تھی۔

سالار کو یہ سوال نہیں تبصرہ لگا۔

”جی۔“ اس نے ان کی تائید کی۔

”وہ مردوں میں جاتے ہیں جو اپنی بیویوں کو تنگ کرتے ہیں۔“ سعیدہ اماں نے اگلا جملہ بولا۔

اس بار سالار فوری طور پر تائید نہیں کر سکا۔ وہ خود مرد تھا اور شوہر بھی لاکھ وہ امامہ پر مرتا ہو لیکن ”بیوی“ کی موجودگی میں اس بصرے کی تائید اپنے پاؤں پر کھانڈی مارنے کے مصداق تھا۔ وہ شادی کے دوسرے ہی دن اتنی فرماں برداری نہیں دکھا سکتا تھا جس پر وہ بعد میں ساری عمر پچھتا تا۔

اس بار کچھ کہنے کے بجائے اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کی خاموشی نے سعیدہ اماں کو کچھ اور تپا دیا۔

”دوسروں کے دل دکھانے والے کو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔“ سالار نے حلوے کھاتے کھاتے اس جملے پر غور کیا پھر تائید میں سر ہلا دیا۔

”جی بالکل۔“ سعیدہ اماں کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آیا۔

”شریف گھرانے کے مردوں کا وجہ نہیں ہے کہ دوسروں کی بیٹیوں کو پہلے بیاہ کر لے جائیں اور پھر انہیں پہلی بیویوں کے قصے سناتے بیٹھ جائیں۔“

امامہ کی جیسے جان پر بن گئی۔ یہ کچھ زیادہ ہی ہو رہا تھا۔

”آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اماں!“ اس نے صورت حال سنبھالنے کی کوشش کی۔

سالار نے باری باری ان دونوں کو دیکھا اسے اس جملے کا سر پر سمجھ میں نہیں آیا تھا اور پہلے جملوں سے ان کا کیا تعلق تھا وہ بھی سمجھ نہیں پایا لیکن تائید کرنے میں کوئی برائی نہیں تھی کیونکہ بات مناسب تھی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ“ اس نے بالآخر کہا۔

اس کی سعادت مندی نے سعیدہ اماں کو مزید تپا دیا۔ شکل سے کیسا شریف لگ رہا ہے۔ اسی لیے تو سب بھائی بھی دھوکا کھا گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر سبط علی کو غلطی کرنے پر چھوٹ دی۔

”آمنہ کے لیے بہت رشتے تھے۔“ سعیدہ اماں نے سلسلہ کلام جوڑا۔

انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک غلط آدمی کو امامہ کی قدر و قیمت کے بارے میں غلط لیکچر دے رہی تھیں۔ حلوے کی پلیٹ ہاتھ میں لیے سالار نے ایک نظر امامہ کو دیکھا پھر سعیدہ اماں کو جو بے حد جوش و خروش سے کہہ رہی تھیں۔

”یہ سامنے والے ظہور صاحب کے بڑے بیٹے نے آمنہ کو کہیں دیکھ لیا تھا۔ ماں باپ کو صاف صاف کہہ دیا اس نے کہا کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے۔ خالہ کی بیٹی کے ساتھ بچپن کی متعلق بھی توڑ دی۔“

اس بار سالار نے حلوے کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ کم از کم امامہ کے کسی ایسے رشتے کی تفصیلات مزے سے حلوہ کھاتے ہوئے نہیں سن سکتا تھا۔ امامہ نے اس بار سعیدہ اماں کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بڑی ہی عامیانہ بات تھی لیکن وہ بھی جیسے چاہتی تھی کہ کوئی سالار کو بتائے کہ وہ ”قابل قدر“ ہے وہ اسے صرف ”بیوی“

کر برتاؤ نہیں کر سکتا۔

”ہوتے کھس گئے لڑکے کی ماں کے یہاں کے چکر لگا لگا کر“ محلے کے ہر معزز آدمی سے کہلوایا اس نے ”میرے ماں تک کو انگلیزنڈ فون کر لیا اس رشتے کے لیے۔“ سعیدہ اماں بول رہی تھیں۔

سالار اب بے حد سنجیدہ تھا اور امامہ قدرے لاطعلقی کے انداز میں سر جھکائے حلوے کی پلیٹ میں چبھ رہا رہی تھی۔

”اس کے ماں باپ نے کہا کہ جو چاہیں حق میں لکھوالیں بس اپنی بچی کو ہماری بیٹی بنا دیں۔“

سالار نے بے حد جتنے والے انداز میں اپنی رست و راج یوں دیکھی جیسے اسے دیر ہو رہی تھی۔ سعیدہ اماں کو اس کی اس حرکت پر بری طرح تاؤ آیا۔ اس گفتگو کے جواب میں کم از کم وہ اس سے اس بے نیازی کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔

”ابھی آج بھی اس کی ماں آئی ہوئی تھی۔ بہت افسوس سے کہہ رہی تھی کہ بڑی زیادتی کی ان کے بیٹے کے ساتھ میں نے۔ ایک بار نہیں دوبارہ۔ کہہ رہی تھی کہ ہمیں چھوڑ کر کسی ایرے غیرے کے ساتھ پکڑ کر بیاہ دیا۔ میرا بیٹا کیوں نظر نہیں آیا آپ کو۔“ رائیوں کی طرح رکھتا آمنہ کو۔ دیکھ دیکھ کر جیتا اسے۔

سعیدہ اماں اب مبالغہ آمیزی کی آخری حدود کو چھونے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے پر اب بھی مرحوبیت نام کی کوئی چیز نمودار نہیں ہوئی تھی۔ وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ انہیں یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ سعیدہ اماں کو لگا انہوں نے اس کے ساتھ شادی کر کے واقعی آمنہ کی قسمت پھوڑی تھی۔

بے حد غلطی کے عالم میں انہوں نے سردی کے موسم میں بھی پانی کا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ میں پیا تھا۔ اس کی یہ خاموشی امامہ کو بھی بری طرح چبھی تھی۔ وہ رات کو اس سے کیا کچھ کہہ رہا تھا اور اب یہاں سعیدہ اماں کو بتانے کے لیے اس کے پاس ایک لفظ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے اہم ہے۔ یا وہ اس کا خیال رکھے گا۔ یا کوئی اور وعدہ۔ کوئی اور تسلی۔ کوئی اور بات۔ کچھ تو کہنا چاہیے تھا اسے سعیدہ اماں کے سامنے۔ اسے عجیب بے قدری اور بے وقعتی کا احساس ہوا تھا۔ رنج کچھ اور سوا ہوا۔ فاصلہ کچھ اور پر مٹا تھا۔ اس نے کسی دوسرے کے سامنے بھی اسے تعریف کے دو لفظوں کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ اکیلے میں تعریف نہ کرے لیکن یہاں ہی کچھ کہہ دیتا۔ کچھ تو۔ اس کا دل ایک بار پھر بھر آیا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ سالار اس سے روایتی شوہروں والا رویہ رکھے لیکن خود وہ اس سے روایتی بیوی والی ساری توقعات لیے بیٹھی تھی۔

”بہت دیر ہو گئی“ میرا خیال ہے“ ہمیں اب چلنا چاہیے۔ مجھے صبح آفس جانا ہے“ آج کل کام کچھ زیادہ ہے۔“ سالار کا پیاناہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔

اس نے بڑے محل کے ساتھ سعیدہ اماں سے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اب امامہ کے کھڑے ہونے کا منتظر تھا لیکن امامہ نے ٹیبل پر رکھے برتن اٹھا کر ٹرے میں رکھتے ہوئے اسے دیکھے بغیر بڑی سرد مہری کے ساتھ کہا۔

”میں آج پیس رہوں گی سعیدہ اماں کے پاس۔“

سالار چند لمحوں کے لیے بالکل بھونچکا رہ گیا۔ اس نے پچھلے کئی گھنٹوں میں ایک بار بھی ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ سعیدہ اماں کے پاس رات گزارنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اب یک دم بیٹھے بٹھائے یہ فیصلہ۔

”ہاں بالکل پیس چھوڑ جاؤ اسے۔“ سعیدہ اماں نے فوری تائید کی۔ امامہ اس کے انکار کی منتظر تھی۔

”ٹھیک ہے“ یہ رہنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ سالار نے بڑی سہولت سے کہا۔

برتن سمیٹتی امامہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس نے ایک منٹ کے لیے بھی اسے ساتھ لے جانے پر اصرار نہیں کیا تھا وہ اتنا تنگ آیا ہوا تھا اس سے۔

اس سے پہلے کہ سالار کچھ اور کہتا وہ ایک جھپٹا کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ سعیدہ اماں نے بے حد قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا سالار نے جیسے امامہ کے ہر الزام کی تصدیق کر دی تھی۔ سالار کو امامہ کے یوں جانے کی وجہ سمجھ میں آئی نہ سعیدہ اماں کی ان ملا متی نظروں کا مفہوم سمجھ سکا وہ۔ وہ گفتگو جتنی آپ سیٹ کرنے والی تھی اتنا ہی امامہ کا ایک دم کیا جانے والا یہ اعلان تھا کہ وہ آج وہیں رہے گی۔ اسے برا لگا تھا لیکن اتنا برا نہیں لگا تھا کہ وہ اس پر اعتراض یا حق کی کا اظہار کرتا اور وہ بھی سعیدہ اماں کے سامنے۔

”اؤکے میں چلتا ہوں پھر۔“ وہ سعیدہ اماں کے ساتھ باہر صحن میں نکل آیا۔ اس کا خیال تھا امامہ کچن میں برتن رکھ کر اسے خدا حافظ کہنے تو ضرور آئے گی لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر سعیدہ اماں سے بے مقصد باتیں کرتا صحن میں کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ سعیدہ اماں کے لیے میں اتنی سرد مہری نہ ہوتی تو ان سے امامہ کو بلوانے کا کہتے ہوئے اسے جھجک محسوس نہ ہوتی۔

سعیدہ اماں کے گھر سے نکلے ہوئے اس نے پہلی بار اس محلے میں ان کے سامنے والے گھر کو سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہاں سے اکیلے واپس آنا اسے کھل رہا تھا۔ وہ اتنے سال اس کے بغیر ہی رہا تھا۔ اسے کبھی تنہائی نہیں چھپی تھی۔ اس نے ایک رات اس کے ساتھ گزار دی تھی اور تنہائی کا مفہوم اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہاں سے واپسی کی ڈرائیو اس کی زندگی کی سب سے طویل ڈرائیو تھی۔

www.urdu novels pdf.com

”کل بھائی صاحب کے ہاں چلیں گے۔ انہیں بتائیں گے یہ سب کچھ۔ وہی بات کریں گے سالار سے۔“ سعیدہ اماں اس کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ وہ بے حد پریشان تھیں۔ امامہ نے ان کی بات کی تائید کی نہ تردید۔ اب اس کا دل کچھ بھی کہنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بس اپنے بیڈ پر کبیل اوڑھے چپ چاپ بیٹھی سعیدہ اماں کی باتیں سنتی رہی۔

”اچھا چلو اب سو جاؤ بیٹا! صبح سحری کے لیے بھی اٹھنا ہو گا۔“ سعیدہ اماں کو اچانک خیال آیا۔ بیڈ سے اٹھ کر کمرے سے نکلے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

”لائٹ آف کروں؟“ پچھلی رات ایک جھپٹا کے ساتھ اسے یاد آئی تھی۔

”نہیں۔ رہنے دیں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے لیٹ گئی۔ سعیدہ اماں دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔ کمرے کی خاموشی نے اسے سالار کے بیڈ روم کی یاد دلائی۔

”ہاں اچھا ہے نا۔ میں نہیں ہوں آرام سے لائٹ آن کر کے سو تو سکتا ہے۔ یہی تو چاہتا تھا وہ۔“ وہ پھر سے رنجیدہ ہونے لگی اور تب ہی اس کا سیل فون بجنے لگا۔ امامہ کے خون کی گردش پل بھر کے لیے تیز ہوئی وہ اسے بالآخر کل کر رہا تھا۔ اس نے بے حد خفگی کے عالم میں فون بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پھینک دیا۔

وہ اسے ساتھ لے کر نہیں گیا اور اب اسے اس کی یاد آ رہی تھی۔ اس کی رنجیدگی غصے میں بدل رہی تھی۔ وہ اس طرح کیوں کر رہی تھی کہ رانی کا پیاٹنار ہی تھی۔ اس نے جیسے اپنا تجربہ کیا اور اس تجربے نے بھی اسے اذیت دی۔ میں زود رنج ہو گئی ہوں یا وہ مجھے جان بوجھ کر بری طرح آگور کر رہا ہے۔ یہ جتنا چاہتا ہے کہ میں اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کے دوست اس کا آفس اس کی فیملی۔ بس یہ اہم ہیں اس کے لیے۔ دوبارہ کال نہیں آئی چند سیکنڈ کے بعد اس کا مہیج کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ یقیناً اس سے کہے گا کہ وہ اسے پس کر رہا تھا۔

ٹیکسٹ مسج میں اس کے لیے ایک ری لوڈ کارڈ کا نمبر تھا اور اس کے نیچے دو لفظ۔ ”گڈ نائٹ سوئیٹ ہارٹ!“ پہلے اسے شدید غصہ آیا پھر بری طرح رونا۔ اسے پہلے بھی زندگی میں سالار سکندر سے برا کوئی نہیں لگا تھا اور آج بھی اس سے برا کوئی نہیں لگ رہا تھا۔

”آمنہ سے بات کرو اور۔ میں اور طیبہ بھی اس سے بات کر لیں۔ شادی کر لی۔ اسے گھر بھی لے آؤ۔ اب کسی کام میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے یا نہیں۔“ سکندر نے ابتدائی سلام و دعا کے ساتھ چھوٹے ہی اس سے کہا۔

”وہ آج اپنے میکے میں ہے۔“ سالار نے کچھ سوچ کر کہا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی سعیدہ اماں کے گھر سے واپس آیا تھا۔

”تو بر خور دار! تم بھی اپنے سسرال میں ہی ٹھہرتے تم منہ اٹھا کر اپنے اپارٹمنٹ کیوں آگئے؟“ سکندر نے اسے ڈانٹا وہ جواباً ہنسا۔

”مئی پاس ہی ہیں؟“ اس نے موضوع بدلا۔

”ہاں۔ کیوں بات کر رہی ہے؟“

”نہیں مئی الحال تو آپ ہی سے بات کرنی ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ سیریس بات کرنی ہے۔“

سکندر یک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ”یہ سالار سکندر تھا؟“ اگر سیریس کہہ رہا تھا تو بات یقیناً ”بہت سیریس تھی۔“

”کیا بات ہے؟“

”مجھے اصل میں آمنہ کے بارے میں آپ کو کچھ بتانا ہے۔“

سکندر اچھ گئے۔ وہ آمنہ کے بارے میں انہیں نکاح کے بعد بتایا چکا تھا۔ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹی جس کے ساتھ اس نے اپنی کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر ایمر جنسی میں نکاح کیا تھا۔ سکندر عثمان ڈاکٹر سبط علی کو جانتے تھے اور سالار کے توسط سے دو تین بار ان سے مل بھی چکے تھے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹی کے بجائے کسی بھی لڑکی سے اس طرح اچانک ان لوگوں کو مطلع کے بغیر نکاح کرتا تھا۔ انہیں اعتراض نہ ہوتا۔ وہ اور ان کی بیٹی کچھ اتنی ہی لبرل تھی اور سالار تو بہر حال ”اسپیشل کیس“ تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ شادی ”انسانوں“ کی طرح کرنا۔ یہ بھروسہ طیبہ کا تھا جو انہوں نے اس کے نکاح کی خبر ملنے پر قدرے خفگی لیکن اطمینان کے ساتھ کیا تھا اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ اسے آمنہ کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔

”کیا بتانا ہے آمنہ کے بارے میں؟“

سالار نے گلا صاف کیا۔ بات کیسے شروع کرے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”آمنہ اصل میں امامہ ہے۔“ تمہید اس نے زندگی میں کبھی نہیں باندھی تھی پھر اب کیسے باندھتا۔ دوسری طرف یک دم خاموشی چھا گئی۔ سکندر کو لگا کہ انہیں سننے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

”کیا۔ کیا مطلب؟“ انہوں نے جیسے تصدیق چاہی۔

”امامہ کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ وہ اتنے سالوں سے ان ہی کے پاس تھی۔ انہوں نے اس کا نام چھینج کر دیا تھا اس کے تحفظ کے لیے مجھے نکاح کے وقت یہ بتانا نہیں تھا کہ وہ امامہ ہے، لیکن وہ امامہ ہی ہے۔“ آخری جملے کے علاوہ اسے باقی کی تفصیل احمقانہ نہیں لگی۔

سکندر عثمان نے رکتی ہوئی سانس کے ساتھ برابر کے بیڈ پر بیٹھی بیوی کو دیکھا جو اشارہ پس پر کوئی ٹاک شویہ دیکھنے میں مصروف تھی اور یہ اچھا ہی تھا۔
وہ اسی طرح رکتی ہوئی سانس کے ساتھ، ننگے پاؤں اپنے بستر سے اتر کر بیڈ روم کا دروازہ کھول کر بے حد عجلت کے عالم میں باہر نکل گئے۔ طیبہ نے کچھ حیرت سے انہیں اس طرح اچانک جاتے دیکھا۔
”ایک تو ان باب بیٹے کا رومانس ہی ختم نہیں ہوتا اب دو گھنٹے لگا کر آئیں گے۔“ طیبہ نے قدرے خفگی سے سوچا اور دوبارہ بیوی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
باہر لاؤنج میں سکندر عثمان کے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے۔ وہ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی طیبہ کے ساتھ اپنے آخری اولاد کے ”سیٹل“ ہو جانے پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس کا ولیمہ پلان کر رہے تھے اور انہیں وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ وہ آخری اولاد ”سالار سکندر“ تھا۔
دو گھنٹے تک لاؤنج میں اس کے ساتھ طویل گفت و شنید کے بعد وہ جب بالآخر واپس بیڈ روم میں آئے تو طیبہ سو چکی تھیں لیکن سکندر عثمان کی نیند اور اطمینان دونوں رخصت ہو چکے تھے۔

سکندر عثمان اس سے ناراض نہیں ہوئے تھے لیکن وہ ان تمام خدشات کو سمجھ سکتا تھا جو یک دم ان کے ذہن میں جاگ اٹھے تھے۔ اتنے سال سے ہاشم مبین کی فیملی کے ساتھ ان کے تمام تعلقات مکمل طور پر منقطع تھے لیکن اس کے باوجود سب کچھ پر سکون تھا۔ امامہ کی اس فوری گمشدگی کے بعد شروع کے چند مہینے وہ انہیں تنگ کرتے رہے تھے لیکن جوں جوں انہیں یقین ہوتا گیا کہ سکندر عثمان اور سالار کا واقعی امامہ کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے تو ساری گرد جیسے آہستہ آہستہ پٹھتی گئی۔ اس کے باوجود ہاشم مبین کو اب بھی یقین تھا کہ رابطہ نہ ہونے کے باوجود امامہ کو بھگالنے میں سالار کا کسی نہ کسی طرح ہاتھ ضرور تھا، مگر یہ بات ثابت کرنا مشکل تھا اور اب نو سال بعد یک دم جیسے ”ثبوت“ سامنے آگیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہاشم مبین اور اس کی فیملی کیا طوفان اٹھاتی ”اس کے بارے میں سکندر کو کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ اگر پریشان تھے تو سالار ان کی پریشانی سمجھ سکتا تھا۔
ان سے بات کرنے کے بعد وہ سونے کے لیے بیڈ پر آکر لیٹ گیا اور اس وقت اسے ایک بار پھر امامہ یاد آئی۔ اس نے گردن موڑ کر اس خالی بستر اور تنکے کو دیکھا۔ اسے پچھلی رات اس تنکے پر بکھری زلفیں یاد آئیں۔ چند لمحوں کے لیے اسے یوں لگا جیسے وہ وہیں تھی۔ اس تنکے سے اس کے کندھے اور اس کے کندھے سے اس کے سینے تک آئی ہوئی وہ سیاہ رگڑی زلفیں ایک بار پھر اس سے لپٹنے لگی تھیں۔
اس نے لائٹ آف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پچھلی رات نہیں تھی کہ اسے تاریکی میں بھی نیند آجاتی۔

وہ ساری رات نہیں سوئی۔ غصہ، رنج، افسوس اور آنسو۔ وہ ایک کیفیت سے نکلتی دوسری میں داخل ہوتی رہی۔
سحری کے وقت بھی اس کا بیل بستر سے نکل کر سعیدہ اماں کا سامنا کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ انہیں اپنی اتری ہوئی شکل دکھانا نہیں چاہتی تھی لیکن مجبوری تھی۔ سعیدہ اماں اسے مجبور نہ کرتیں تو وہ سحری کھائے بغیر روزہ رکھتی۔ واپس کمرے میں آئے پر اس نے ایک بار پھر اپنے بیل پر سالار کی مسند کال دیکھی۔ اس نے بیل آف کیا اور کبیل لپیٹ کر سو گئی۔
سالار نے دس بجے کے قریب آنسو سے اسے کال کی، بیل آف تھا۔ گیارہ بجے کال کرنے پر ایک بار پھر بیل۔

آف ملا۔ اس بار اس نے سعیدہ اماں کی لینڈ لائن پر کال لی۔
”امامہ سو رہی ہے۔“ انہوں نے چھوٹے ہی سرومہی سے اسے اطلاع دی۔
”اچھا جب وہ اٹھے تو آپ اس سے کہیں کہ مجھے کال کر لے۔“ اس نے پیغام دیا۔
”دیکھوں گی اگر اس کے پاس فرصت ہوئی تو کر لے گی۔“
سعیدہ اماں نے یہ کہہ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ وہ بیل ہاتھ میں پکڑے رہ گیا۔ اگلے پانچ منٹ وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا سعیدہ اماں کے جواب پر غور کرتا رہا۔
امامہ کو اس کا پیغام مل گیا تھا اور سعیدہ اماں نے سالار کو دیا جانے والا جواب بھی اسے سنا دیا۔ وہ خاموش رہی۔
”آج بھائی صاحب کی طرف چلیں گے۔“ سعیدہ اماں نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔
”آج رہنے دیں سالار کے گھر والے آرہے ہیں بعد میں بات کریں گے۔“ امامہ نے سعیدہ اماں سے کہا۔
سالار نے ڈیڑھ بجے کے قریب فون کیا اور اس کی آواز سننے ہی کہا۔
”متھنک گاڈ! تمہاری آواز تو سننا نصیب ہوا مجھے۔“ وہ جواباً ”خاموش رہی۔“
”ڈاکٹر صاحب کا ڈرائیور پہنچنے ہی والا ہو گا، تم تیار ہو جاؤ۔“ سالار نے اس کی خاموشی نوٹس کیے بغیر اسے اطلاع دی۔

”ڈنر کے لیے کیا بنانا ہے؟“ امامہ نے جواباً ”کہا۔“

”کون سا ڈنر؟“

”تمہارے پیرئس کھانا نہیں کھائیں گے کیا؟“

”نہیں، ڈنر فرقان کے گھر پر ہے۔“

”میں ڈنر خود تیار کر لوں گی۔“ اس نے اس اطلاع پر دو ٹوک انداز میں کہا۔

”نہ ڈنر وہ ہم دونوں کے لیے نہیں بلکہ ممی پاپا اور انیتا کے لیے کر رہا ہے۔“ وہ کچھ خفیف سی ہو گئی۔

”لیکن سحری کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا۔“

”میری فیملی میں روزے وغیرہ کوئی نہیں رکھتا، لیکن پوچھ لوں گا اور کر لیں گے کچھ نہ کچھ۔ فرق میں بہت کچھ ہے۔ تم اس بجھٹ میں نہ پڑو۔“

”ہیلو! سالار نے جیسے لائن پر اس کی موجودگی کو چیک کیا۔“

”میں سن رہی ہوں۔“ اس نے جواباً ”کہا۔“

”امامہ! تم اور سعیدہ اماں کل رات کو روکیوں رہی تھیں۔؟“

سالار نے بالآخر وہ سوال کیا جو پچھلی رات سے اسے تنگ کر رہا تھا۔

”ایسے ہی۔“ وہ کچھ دیر کے لیے جواب نہیں دے سکی۔

”اور سعیدہ اماں کا موڈ بھی کچھ آف تھا؟“

”ہم نہیں۔ تم پوچھ لیتے۔“ اس نے اب بھی اسی انداز سے کہا۔

”میں پوچھنا چاہتا تھا مگر مجھے لگا کہ ابھی مناسب نہیں۔“ سالار نے کہا امامہ جواباً ”خاموش رہی۔“

”چلو تم اب تیار ہو جاؤ، گھر پہنچ جاؤ تو مجھے ٹیکسٹ بھیج کرنا۔ اگر میں فری ہوا تو تمہیں کال کر لوں گا۔“ امامہ نے جواباً ”خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کا دل چاہتا تھا اس سے کہے ”ضرورت نہیں۔“

وہ تقریباً ”اڑھائی بجے ڈاکٹر صاحب کے ڈرائیور کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچی تھی اور اس نے آتے ہی

سب سے پہلے دونوں بیڈرومنز چیک کیے تھے۔ بیڈرومنز باہر تھے۔ بیڈرومنز میں کچھ رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سالار آفس جانے سے پہلے یقیناً ہر کام خود ہی کر کے گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے وجود کو ”بے مصرف“ محسوس کیا۔

ایک بیڈرومن شاید پہلے ہی گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا، جبکہ دوسرا بیڈرومن اسٹڈی کے طور پر بھی استعمال کر رہا تھا۔ وہاں ایک ریک پر کتابوں کے ڈھیر کے علاوہ اسی طرح کے ریکس پر سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز کے انبار بھی نظر آئے۔ سنگ روم میں موجود ریکس پر بھی ڈی وی ڈیز اور سی ڈیز تھیں لیکن ان کی تعداد اس کمرے کی نسبت بہت کم تھی۔ کمرے میں کچھ میوزیکل انسٹرومنٹس بھی پڑے ہوئے تھے اور ایک اسٹڈی ٹیبل پر جس پر ایک ڈیسک ٹاپ تھا۔ وہ اسٹڈی ٹیبل اس کمرے کی وہ واحد چیز تھی جس پر بڑے کاغذ، فائلز اور ڈیسک آرگنائزر اسے بے ترتیب نظر آئے۔ وہ اچھے سے پہلے اسے ٹھیک کرنا بھول گیا تھا یا شاید اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ وہ ان پیپر ڈکو ٹھیک کر دے، اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے خدشہ تھا کہ یہ کام سالار جیسی پرفیکشن کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی اور اگر کوئی پیپر اوہرا دھر ہو گیا تو۔۔۔؟

وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ فریق اور فریزر میں واقعی کھانے کا بہت سا سامان تھا اور اس کو یقین تھا کہ ان میں سے نوے پر سنٹ اشیاء فرقان اور نوشین کی مرہون منت تھیں۔ جو چیزیں سالار کی اپنی خریداری کا نتیجہ تھیں ان میں پھلوں کے علاوہ ڈرنکس اور ٹرن ہیکل فوڈ آئٹمز کی ایک محدود تعداد تھی۔ اس نے چند ٹرن نکال کر دیکھے وہ تقریباً سب کے سب سی فوڈ تھے۔

امامہ کو کھانے میں صرف ایک چیز ناپسند تھی۔ سی فوڈ۔ روزے کی وجہ سے اس کا معدہ خالی نہ ہوتا تو ان ڈبوں پر بنے ہوئے کھانے اور پرائز دیکھ کر اسے دو مشنگ شروع ہو جاتی۔ اس نے بڑی مایوسی کے عالم میں ان لنڈ کو واپس فریق میں رکھ دیا۔ یقیناً وہ ڈیکوریشن کے مقصد سے خرید کر نہیں رکھے گئے تھے۔ وہ خرید کر لاتا تھا تو یقیناً کھاتا بھی ہو گا۔ اس کا خراب موڈ کچھ اور ابتر ہوا۔ ابھی اور کیا کیا پتا چلنا تھا اس کے بارے میں۔۔۔

اس نے بچن کے کینٹنس کھول کر دیکھے اور بند کر دیے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بچن میں فریق کے علاوہ صرف کافی کینٹنس اور برتنوں کے ریکس کے علاوہ کبھی کبھار کچھ نہیں۔ وہ بچن صرف ناشتے اور سینڈویچ والے میبلز کے علاوہ صرف چائے یا کافی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ وہاں اسے چند فراننگ ہینڈ کے علاوہ کسی قسم کے پکائے کے برتن نظر نہیں آئے۔ بچن میں موجود کراکری بھی ایک ڈرنک سیٹ اور چند وائرل سیٹس پر مشتمل تھی یا اس کے علاوہ کچھ مگز تھے یا پھر بریک فاسٹ سیٹ۔ یقیناً اس کے گھر آنے والے افراد کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔ وہ بچن سے نکل آئی۔

اپارٹمنٹ کا واحد غیر دریافت شدہ حصہ بالکونی تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور وہ پہلی جگہ تھی جہاں آتے ہی اس کا دل خوش ہوا تھا۔ چھ فٹ چوڑی اور بارہ فٹ لمبی وہ میسر نما بالکونی کو میسر گارڈن کہنا زیادہ مناسب تھا۔ مختلف شکلوں اور سائیز کے گھٹلوں میں مختلف قسم کے پودے اور بیلین لگی ہوئی تھیں اور شدید سرد موسم میں بھی ان کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر خاصی محنت اور وقت لگایا گیا تھا۔ وہاں آس پاس کی بالکونیوں سے بھی ایسے سبز رنگ کے پودے اور بیلین جھانکتی نظر آ رہی تھیں لیکن یقیناً سالار کی بالکونی کی حالت سب سے بہتر تھی۔

لاؤنج کی قد آدم کھڑکیاں بھی اسی بالکونی میں تھیں اور بالکونی میں ان کھڑکیوں کے پاس دیوار کے ساتھ زمین پر ایک میٹ موجود تھا۔ وہ شاید یہاں آکر بیٹھتا ہو گا یا دھوپ میں لیٹتا ہو گا۔ شاید ویک اینڈ پر۔۔۔ درنہ سردی کے

موسم میں اس میٹ کی وہاں موجودگی کا مقصد اسے سمجھ میں نہیں آیا۔ بالکونی کی منڈیر کے قریب ایک اسٹول پر ہوا تھا۔ وہ یقیناً وہاں آکر بیٹھتا تھا۔ نیچے دیکھنے کے لیے۔۔۔ منڈیر پر گک کے چند نشان تھے۔ چائے یا کافی پیتا ہے یہاں بیٹھ کر۔۔۔ مگر کس وقت۔۔۔ یقیناً رات کو۔۔۔ اس نے سوچا اور آگے بڑھ کر نیچے جھانکا۔ وہ تیسری منزل تھی اور نیچے بلڈنگ کا لان اور پارکنگ تھے۔ کچھ فاصلے پر کیاؤنڈ سے باہر سڑک بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک پوش ایریا تھا اور سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ وہ واپس اندر آئی۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے ابھی اپنے ہال بنائی رہی تھی جب اسے ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ فوری طور پر اسے نوشین ہی کا خیال آیا تھا۔

لیکن دروازے پر ایک ریسٹورنٹ کا ڈیلیوری بوائے چند پیکٹس لیے کھڑا تھا۔ ”میں نے آرڈر نہیں کیا۔“ اسے لگا شاید وہ کسی غلط اپارٹمنٹ میں آ گیا ہے۔

اس نے جواباً سالار سکندر کا نام ایڈریس کے ساتھ دہرایا۔ چند لمحوں کے لیے وہ چپ سی ہو گئی۔ وہ کم از کم اتنا لاپرواہ نہیں تھا اس کے بارے میں کہ اس کے افطار کے لیے کچھ انتظام کرنا بھول جاتا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے پیئرس کو لینے کے لیے آفس سے نکل چکا ہو گا اور ایرپورٹ پہنچنے کی بھاگ دوڑ میں اسے شاید وہ یاد بھی نہیں ہوگی۔

بچن میں ان پیکٹس کو رکھتے ہوئے اس کا غصہ اور رنجیدگی کچھ کم ہوئی اور یہ شاید اس کا ہی اثر تھا کہ اس نے کال کر کے سالار کو مطلع کرنا اور اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ وہ اس وقت ایرپورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

امامہ نے اسے کھانے کے بارے میں بتایا۔

”میں رات کا کھانا اکثر اس ریسٹورنٹ سے منگواتا ہوں۔ کھانا اچھا ہوتا ہے ان کا۔۔۔“ اس نے جواباً بڑے معمول کے انداز میں کہا۔ ”میں نے سوچا“ میں جب تک ان لوگوں کو لے کر گھر آؤں گا تم تب تک بھوکی بیٹھی رہو گی۔“

وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر یکدم اسے احساس ہوا کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ سالار سے یہ ”دلفظ کہنا“ ایک عجیب سی جھجک تھی جو اسے محسوس ہو رہی تھی۔



وہ تقریباً ”سوانویجے کے قریب آیا اور ڈور بیل کی آواز پر وہ بے اختیار نروس ہو گئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سالار کی فیلکی کے رد عمل سے خائف تھی۔ ایک ہمسائے کے طور پر بھی دونوں فیملی کے درمیان بے حد رسمی تعلقات تھے اور بعد میں ہونے والے واقعات نے تو یہ فارمیٹ بھی ختم کر دی تھی۔ اسے کئی سال پہلے سکندر عثمان سے فون پر ہونے والی گفتگو یاد تھی اور شاید اس کے خدشات کی وجہ بھی وہی کال تھی۔

بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

سکندر عثمان سمیت تینوں افراد اس سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ملے تھے۔ وہ ان کے رویوں میں جس روکے پن اور خفگی کو ڈھونڈ رہی تھی وہ فوری طور پر اسے نظر نہیں آئی۔ امامہ کی نروس نیس میں کچھ کمی آئی۔ فرقان کے گھر ڈرنک کے دوران اس کی یہ نروس نیس اور بھی کم ہوئی۔

انیتا اور طیبہ دونوں بڑے دوستانہ انداز میں نوشین اور اس سے باتیں کرتی رہیں۔ نوشین اور فرقان سالار کے والدین سے پہلے بھی مل چکے تھے لیکن نوشین انیتا سے پہلی بار مل رہی تھی اور دونوں کا موضوع گفتگو ان کے بچے

تھے۔ وہ بے حد پرسکون انداز میں ایک خاموش سامع کی طرح ان لوگوں کی باتیں سنتی رہی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فرقان کے گھر میں اس کی شادی یا اس کی ذات موضوع گفتگو بنے۔

اپنے اپارٹمنٹ میں واپسی کے بعد پہلی بار سکندر اور طیبہ نے سٹنگ روم میں بیٹھے اس سے بات کی اور تب امامہ نے ان کے لہجے میں چھپی اس تشویش کو محسوس کیا جو امامہ کی فیملی کے متوقع رد عمل سے انہیں تھی۔ اس کا اعتماد ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ اگرچہ انہوں نے کھلے عام امامہ کے سامنے ہاشم مبین یا ان کے خاندان کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی لیکن وہ لوگ اب ولیمہ کا فنکشن اسلام آباد کے بجائے لاہور میں منعقد کرنا چاہتے تھے۔ وہ سالار کی رائے سننا چاہتی تھی لیکن وہ گفتگو کے دوران خاموش رہا۔ جب گفتگو کے دوران خاموشی کے وقفوں کی تعداد بڑھنے لگی تو یکدم امامہ کو احساس ہوا کہ گفتگو میں آنے والی اس بے ربطی کی وجہ وہ تھی۔ وہ چاروں اس کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کر پارے تھے۔

”بالکل بیٹا! تم سو جاؤ، تمہیں سحری کے لیے اٹھنا ہو گا۔ ہم لوگ تو ابھی کچھ دیر بیٹھیں گے۔“

اس کے نیند آنے کے بہانے پر سکندر عثمان نے فوراً کہا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ نیند آنا بہت مشکل تھی۔ دو دن پہلے جن خدشات کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا اب وہ ان کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ سکندر عثمان ان دونوں کی شادی کو خفیہ ہی رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اس کی فیملی کو اس کے بارے میں پتہ نہ چلے۔

وہ بہت دیر تک اپنے بیڈ پر بیٹھی ان خدشات اور خطرات کے بارے میں سوچتی رہی جو انہیں محسوس ہو رہے تھے۔ اس وقت وہاں اکیلے بیٹھے پہلی بار اس نے سوچا کہ اس سے شادی کر کے سالار نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ جو بھی اس سے شادی کرتا وہ کسی نہ کسی حد تک خود کو غیر محفوظ ضرور کر لیتا لیکن سالار سکندر کی صورت میں صورت حال اس لیے زیادہ خراب ہوتی کیونکہ اس کے ساتھ اس کے اس رشتے کا انکشاف ہونے کے چانسز زیادہ تھے۔

وہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے تھے۔ اس نے سوچا۔ مجھے یا سالار کو جان سے تو کبھی نہیں ماریں گے۔ اسے اب بھی اندھا اعتماد تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کی فیملی اتنا لحاظ ضرور کرے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کریں گے اور پھر سالار سے طلاق دلوں کر کہیں اور شادی کرنا چاہیں گے۔ اس کے اضطراب میں یکدم مزید اضافہ ہوا۔ سب کچھ شاید اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی یا سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ اپنی مرضی سے کہیں شادی کرنے کا مسئلہ نہیں تھا، یہ مذہب میں تبدیلی کا معاملہ تھا۔ اسے اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی محسوس ہوئیں وہ واپس بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ اس وقت پہلی بار سالار سے شادی کرنا اسے ایک غلطی لگی۔ وہ ایک بار پھر اسی کھالی کے کنارے آکر کھڑی ہو گئی تھی جس سے وہ اتنے سالوں سے بچتی پھر رہی تھی۔

www.urdu novels pdf.com



”اب کیا ہو گا؟“ طیبہ نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔

”اب ہونے کو وہ کیا گیا ہے؟“ سکندر عثمان نے جواباً کہا۔ وہ جانتے تھے طیبہ کا اشارہ کس طرف تھا۔

”ہاشم مبین کو پتا چل گیا تو۔۔۔؟“

”اسی لیے تو اس سے کہا ہے کہ امامہ کو دیہ رکھے لاہور میں۔ اسلام آباد نہیں لائے۔ ویسے بھی پی ایچ ڈی کے لیے تو اسے اگلے سال چلے ہی جانا ہے۔ تب تک تو گور ہو سکتا ہے یہ سب کچھ۔“ سکندر عثمان نے اپنے گلاسز اتارتے ہوئے کہا۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹنے والے تھے۔

طیبہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے کہا ”مجھے تو بڑی عام سی لگی ہے امامہ۔“

”تمہارے بیٹے سے بہتر ہے۔“ سکندر عثمان نے ترکی بہ ترکی کہا۔ طیبہ کچھ ناراض ہوئیں۔

”کیوں۔ سالار سے کس طرح بہتر ہے؟ وہ اس کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ آپ خود ایمان داری سے بتائیں۔“

سکندر ہنس پڑے۔

”اتنی ہنسی کس بات پر آ رہی ہے آپ کو؟“ وہ چہرے۔

سکندر واقعی بہت خوشگوار موزوں شخص تھے۔

”میں واقعی بہت خوش ہوں کیونکہ میرا بیٹا بڑا خوش ہے۔ اتنے سالوں بعد اس طرح باتیں کرتے دیکھا ہے اسے۔ میں نے زندگی میں کبھی اس کے چہرے پر ایسی رونق نہیں دیکھی۔ امامہ کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی ہے۔“

میرے ٹوکنڈھوں سے بوجھ اتر گیا ہے۔ اس کے سامنے کتنا شرمندہ رہتا تھا میں، تمہیں اندازہ بھی ہے۔“

طیبہ خاموشی سے ان کی بات سن رہی تھیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔

نیند میں وہ اس کے ہاتھوں میں رسیاں باندھ کر اسے کھینچ رہے تھے۔ رسیاں اتنی سختی سے باندھی ہوئی تھیں کہ اس کی کلائیوں سے خون رسنے لگا تھا اور ان کے ہر جھٹکے کے ساتھ وہ درد کی شدت سے بے اختیار چلائی۔ وہ کسی بازار میں لوگوں کی بھیڑ کے درمیان کسی قیدی کی طرح لے جانی جا رہی تھی۔ دونوں اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ بلند آواز میں تھمتھے لگاتے ہوئے اس پر آوازے کس رہے تھے۔ پھر ان لوگوں میں سے ایک مرد نے جو اس کی کلائیوں میں بندھی رسیوں کو کھینچ رہا تھا۔ پوری قوت سے رسی کو جھٹکا دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل اس پتھر پر لے راستے پر گری۔

”امامہ۔ امامہ۔ اٹھ جاؤ۔ سحری ختم ہونے میں تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔“

وہ ہڑبڑا کر اٹھی، بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیا۔ سالار اس کے پاس کھڑا نرمی سے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے اسے جگا رہا تھا۔

”مسوری۔ میں نے شاید تمہیں ڈرا دیا۔“ سالار نے معذرت کی۔

وہ کچھ دیر تک خالی ذہن کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ گزرے ہوئے سالوں میں ایسے خواب دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی اور خوابوں کا یہ سلسلہ اب بھی نہیں ٹوٹا تھا۔

”کوئی خواب دیکھ رہی تھیں؟“

سالار نے جھک کر گود میں رکھے اس کے ہاتھ کو ہلاتے ہوئے پوچھا۔ اسے یوں لگا تھا وہ ابھی بھی نیند میں تھی۔

امامہ نے سر ہلادیا۔ وہ اب نیند میں نہیں تھی۔

”تم کب مل لیے بغیر سو گئیں؟“ سالار نے گلاس میں پانی اندھلتے ہوئے کہا۔ امامہ نے چونک کر بیڈ پر پڑے کبل

کو دیکھا۔ وہ واقعی اسی طرح پڑا تھا۔ یقیناً ”وہ بھی رات کو کمرے میں سونے کے لیے نہیں آیا تھا۔ کمرے کا ہیٹر آن

رہا تھا، ورنہ وہ سردی لگنے کی وجہ سے ضرور اٹھ جاتی۔

”جلدی آجاؤ، بس دس منٹ رہ گئے ہیں۔“

وہ اسے پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد جب وہ سنگ ایریا میں آئی تو وہ سحری کرچکا تھا اور چائے بنانے میں مصروف تھا۔ لاؤنج

یا کچن میں اور کوئی نہیں تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کے لیے پہلے ہی سے برتن لگے ہوئے تھے۔

”میں چائے بناتی ہوں۔“ وہ سحری کرنے کے بجائے مک نکالنے لگی۔

”تم آرام سے سحری کرو، ابھی اذان ہو جائے گی۔ میں اپنے لیے چائے خود بنا سکتا ہوں، بلکہ تمہارے لیے بھی

بنا سکتا ہوں۔“ سالار نے مک اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اسے واپس بھیجا۔

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”یہ سب لوگ سو رہے ہیں؟“

”ہاں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سوئے ہیں۔ ساری رات تو باتیں کرتے رہے، ہم لوگ اور شاید ہماری آوازوں

کی وجہ سے تم ڈسٹرب ہوئی رہیں۔“

”نہیں، میں سو گئی تھی۔“ اس کا لہجہ بہت بجا ہوا تھا۔ سالار نے محسوس کیا وہ اسے بہت اپ سیٹ لگی۔

”کیا کوئی زیادہ برا خواب دیکھا ہے؟“

وہ چائے کے مک ٹیبل پر رکھتے ہوئے کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”خواب۔“ وہ چونکی۔ ”نہیں۔ ایسے ہی۔“ وہ کھانا کھانے لگی۔

”صبح ہاتھ کتنے بجے کریں گے یہ لوگ۔“ اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

وہ بے اختیار ہنسا۔

”یہ لوگ۔ کون سے لوگ۔ یہ تمہاری دوسری فیملی ہے۔ ممی، پایا، کوا، انہیں اور انیتا کو ایتنا۔“ وہ اس کی

بات پر بے اختیار شرمندہ ہوئی۔ وہ واقعی کل رات سے ان کے لیے وہی دو لفظ استعمال کر رہی تھی۔

”انیتا، شتا تو نہیں کریں گے۔ ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک اٹھ جائیں گے۔ دس بجے کی فلاسٹ ہے۔“ سالار نے

اس کی شرمندگی کو بھانپتے ہوئے بات بدل دی۔

”صبح نو بجے کی۔ اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”صرف تم سے ملنے کے لیے آئے تھے یہ لوگ، پایا کی کوئی میٹنگ ہے آج دو بجے اور انیتا تو اپنے بچوں کو ملازمہ

کے پاس چھوڑ کر آئی ہے۔ چھوٹی بیٹی تو صرف چھ ماہ کی ہے اس کی۔“ وہ بتا رہا تھا۔ ”چائے پیس گئے ناشتے کے

بجائے وہ تم بنا رہا۔ میں ابھی نماز پڑھ کر آجاؤں، پھر ان کے ساتھ ہی آفس کے لیے تیار ہوں گا اور انہیں

ایر پورٹ چھوڑ کر پھر آفس چلا جاؤں گا۔“ سالار نے جمالی روکتے ہوئے چائے کا خالی مک اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔ اما

نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔

”تم سوو گے نہیں؟“

”نہیں، شام کو آفس سے آنے کے بعد سوؤں گا۔“

”تم چھٹی کے لیے۔“ امامہ نے روانی سے کہا۔

سنگ کی طرف جاتے ہوئے سالار نے پلٹ کر امامہ کو دیکھا اور پھر بے اختیار ہنسا۔ ”سونے کے لیے آفس سے

چھٹی لے لیتا؟ میرے پروفیشن میں ایسا نہیں ہوتا۔“

”تم سوئے نہیں رات کو اس لیے کہہ رہی ہوں۔“ وہ اس کی بات پر جھنجھکی تھی۔
 ”میں اڑتالیس، اڑتالیس گھنٹے بغیر سوئے یو این کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔ وہ بھی شدید گرمی اور سردی میں۔
 ڈیزاسٹر اسٹرٹین ایریا میں اور رات کو تو ماں باپ کے پاس بیٹھا پرفیکٹ کنڈیشن میں باتیں کرتا رہا ہوں، غصہ کتنا
 کیوں؟“

اذان ہو رہی تھی۔

”آپ پلیز مک مت دھونا مجھے ابھی اپنے برتن دھونے ہیں۔“ امامہ نے چائے کا مک خالی کرتے ہوئے اسے
 روکا۔ وہ بیگ نکال کر ویسٹ باسکٹ میں پھینکنے لگی تھی۔
 ”ٹھیک ہے۔۔۔ دھوئے۔۔۔“

سالار نے بڑی خوش دلی کے ساتھ مک سنک میں رکھا اور پلٹ کر وہ کوڑے دان کا ڈھکن ہٹائے ہوئے فق ہوتی
 رنگت کے ساتھ ٹی بیگ ہاتھ میں پکڑے کسی بت کی طرح کھڑی تھی۔ سالار نے ایک نظرا سے دیکھا پھر کوڑے
 دان کے اندر پڑی اس چیز کو جس نے اسے یوں شاکند کر دیا تھا۔

”نان الکحولک ڈرنک۔“ وہ دم ہم آواز میں کہتے ہوئے کچن سے باہر نکل گیا تھا۔

وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی۔ اسے یقین تھا۔ وہ اس کوڑے دان کے اندر پڑے جگر بزرگ کے اس خالی کین کو وہاں
 سے نہیں دیکھ سکتا تھا جہاں وہ کھڑا تھا اس کے باوجود اس کو ہوتا تھا کہ وہ کیا چیز دیکھ کر سکتے ہیں آئی تھی۔

اس نے جگر بعد میں پڑھا تھا، بیس پہلے۔ اور یہ سالار سکندر کا گھر نہ ہوتا تو اس کا ذہن پہلے نان الکحولک
 ڈرنکس کی طرف جاتا مگر یہاں اس کا ذہن بے اختیار دوسری طرف گیا تھا۔ جھک کر ٹی بیگ پھینکتے ہوئے اس نے
 نان الکحولک کے لفظ بھی کین پر دیکھ لیے تھے۔ کچھ دیروں کھڑی وہ اپنی ندامت ختم کرنے کی کوشش کرتی
 رہی۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا ہو گا میرے بارے میں اور سالار کو بھی واقعی کرنٹ لگا تھا۔ وہ دونوں اپنے درمیان اعتماد
 کا جوکل بنانے کی کوشش کر رہے تھے وہ بھی ایک طرف سے ٹوٹ رہا تھا، کبھی دوسری طرف سے۔

اس نے آخری بار شراب آٹھ سال پہلے پی تھی، لیکن وہ انرجی اور نان الکحولک ڈرنکس تقریباً ہر رات کام
 کے دوران پیتا تھا۔ امامہ کو ویسٹ باسکٹ کے پاس شاکند دیکھ کر اسے یہ جاننے میں سیکنڈ بھی نہیں لگے تھے کہ
 ویسٹ باسکٹ میں بڑی کون سی چیز اس کے لیے شاکنگ ہو سکتی ہے۔

وہ کارپوریٹ سیکٹر سے تعلق رکھتا تھا اور جن پارٹیز میں جاتا تھا وہاں ڈرنکس ٹیبل پر شراب بھی موجود ہوتی تھی
 اور ہر بار اس ”مشروب“ سے انکار پر کسی نے پچھلے آٹھ سال کے دوران شاید ایک بار بھی یہ نہیں سوچا ہو گا کہ وہ
 جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی نو سال پہلے والے سالار سکندر سے واقف نہیں تھا۔ لیکن وہ ایک
 فرد جو دن پہلے اس کے گھر میں آیا تھا اس کے پاس سالار کی کسی بھی بات اور عمل پر شبہ کرنے کے لیے بڑی
 ٹھوس وجوہات موجود تھیں۔

”یہ سب تو ہو گا ہی۔ ایسی حرکتیں نہ کرتا تب قابل اعتبار ہوتا۔ اب جبکہ ماضی کچھ اتنا صاف نہیں ہے تو اس
 پر اپنا اعتبار قائم کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔“ بیرونی دوا دے کی طرف جاتے ہوئے اس نے بڑی آسانی کے
 ساتھ سارا الزام اپنے سر لے کر امامہ کو بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔

”تمہارے کپڑے پریس کروں؟“ اس نے بیڈ روم میں آکر پوچھا۔ وہ ڈرنک روم میں وارد و روبر کھولے
 اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔

”نہیں، میرے کپڑے تو پریس ہو کر آتے ہیں۔“ ایک ہنگر نکالتے ہوئے وہ پلٹ کر مسکرایا تھا۔

امامہ کو یک دم اپنے کانوں کے بندے یاد آئے۔
 ”تم نے میرے ایریرنگز کہیں دیکھے ہیں میں نے واش روم میں رکھے تھے وہاں نہیں ملے مجھے۔“
 ”ہاں میں نے اٹھائے تھے وہاں سے۔ وہ ڈرنک ٹیبل پر ہیں۔“ سالار دو قدم آگے بڑھا اور ایریرنگز اٹھا کر
 امامہ کی طرف بڑھا دیے۔

”یہ پرانے ہو گئے ہیں۔ تم آج میرے ساتھ چلنا میں تمہیں نئے لے دوں گا۔“

وہ ایریرنگز کانوں میں پہنتے ہوئے تھکی۔
 ”یہ میرے ابو نے دیے ہیں جب مجھے میڈیکل میں ایڈمیشن ملا تھا۔ میرے لیے پرانے نہیں ہیں۔ تمہیں
 ضرورت نہیں ہے اپنے پیسے ضائع کرنے کی۔“

اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے امامہ نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہیں کی۔ وہ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر
 چلی گئی تھی۔ وہ اگلے کچھ سیکنڈز وہیں کھڑا رہا۔ وہ محبت سے کی ہوئی آفر تھی جسے وہ اس کے منہ پر مار کر گئی تھی۔ کم
 از کم سالار نے یہی محسوس کیا تھا۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ محبت سے کی جانے والی اس آفر کو اس نے
 ضرورت پوری کرنے والی چیز بنا دیا تھا۔ وہ مرد تھا، ضرورت اور محبت میں فرق نہیں کہتا تھا۔ وہ عورت تھی
 ضرورت اور محبت میں فرق رکھتے رکھتے مر جاتی۔

www.urdu novels pdf.com

ڈاکٹر سبط علی کو اس دن صبح ہی سعیدہ اماں سے طویل گفتگو کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ دو یا تین دن بعد ان کی
 خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا کرتے تھے اور آج بھی انہوں نے سعیدہ اماں کی طبیعت پوچھنے کے لیے ہی
 فون کیا تھا۔ وہ ان کی آواز سنتے ہی پھٹ پڑی تھیں۔ ڈاکٹر سبط علی بے یقینی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ انہیں
 سعیدہ اماں کی کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

”آمنہ نے آپ سے یہ کہا کہ سالار اپنی پہلی بیوی کی باتیں کرتا رہا ہے؟“ انہیں لگا کہ انہیں سعیدہ اماں کی بات
 سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

”وہ بے چاری تو روتی رہی ہے۔ فون پر بھی۔ اور میرے پاس بیٹھ کر بھی۔ سالار نے اس کے ساتھ اچھا
 سلوک نہیں کیا۔ اس سے ٹھیک طرح سے بات تک نہیں کرنا وہ۔ بھائی صاحب! آپ نے بڑا ظلم کیا ہے بچی
 پر۔“ سعیدہ اماں ہمیشہ کی طرح جذباتی ہو رہی تھیں۔

”مجھے لگتا ہے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے وہ دونوں تو پرسوں میرے پاس آئے ہوئے تھے بالکل ٹھیک ٹھاک اور
 خوش تھے۔“ ڈاکٹر سبط علی پریشان کم اور حیران زیادہ ہو رہے تھے۔

”اور آپ کے گھر سے واپسی پر وہ اسے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ بے چاری ساری رات روتی رہی۔“

”آمنہ آپ کے ہاں رہی پرسوں؟“ وہ پہلی بار جوئے تھے۔

”تو اور کیا؟ سالار تو اس کو لے کر جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اس کے ماں باپ آرہے تھے کل۔ تو اس لیے
 مجبوراً لے گیا اسے۔ اور آمنہ بھی بڑی پریشان ہے سارا دن چپ بیٹھی رہی۔ آپ تو بھائی صاحب بڑی تعریفیں
 کیا کرتے تھے بڑا نیک، صالح بچہ ہے لیکن یہ تو بڑا خراب نکلا۔ ابھی سے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے اس نے۔“

اس وقت ڈاکٹر سبط علی کے چوہہ طبق روشن ہو رہے تھے۔ امامہ اس رات ان کے گھر پر بھی خاموش بیٹھی رہی
 تھی، لیکن انہیں یہ شائبہ تک نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف ہوا ہے۔

اور سالار کی پہلی بیوی۔؟ کون سی پہلی بیوی نکل آئی تھی جس کا حوالہ اس نے سعیدہ اماں کو دیا تھا۔ وہ اب پہلی بار سالار کے بارے میں پریشان ہونے لگے تھے کیا انہوں نے کوئی غلطی کر دی تھی؟ بے حد پریشانی کے عالم میں انہوں نے امامہ کو فون کیا۔ امامہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سعیدہ اماں ڈاکٹر سبط علی سے واقعی سب کچھ کہہ دیں گی اور وہ بھی اتنی جلدی۔ ڈاکٹر سبط علی نے اس کا حال احوال پوچھتے ہی اس سے اگلا سوال یہی کیا تھا۔

”سعیدہ بہن نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کو سالار سے کچھ شکایتیں ہیں۔“ وہ بے حد پریشان لگے تھے۔ امامہ کا حلق یک دم خشک ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اقرار کرے یا انکار۔ اس کی خاموشی نے ڈاکٹر سبط علی کو مزید پریشان کیا۔

www.urdu novels pdf.com

”اور سالار آپ سے کون سی پہلی بیوی کے بارے میں باتیں کرتا رہا ہے۔؟“ وہ بے اختیار ہونٹ کاٹنے لگی اس کا ذہن اس وقت بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ سالار کے خلاف تمام شکایات کو الزامات کے طور پر دہرانا چاہتی تھی، لیکن اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ وہ ڈاکٹر سبط علی سے اتنی بے تکلفی کے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس نے سعیدہ اماں سے کہا تھا۔ سعیدہ اماں سے شکایتیں کرتے ہوئے اس نے مبالغے سے بھی کام لیا تھا اور اسے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ سعیدہ اماں نے اس کی کون سی بات کس طرح انہیں بتائی ہے۔ اس کی مسلسل خاموشی نے ڈاکٹر سبط علی کی پریشانی میں اضافہ کیا۔

”بیٹا! جو بھی بات ہے آپ مجھے بتا دیں۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ”ابو! وہ مجھے بہت انگور کرتا ہے، ٹھیک سے بات نہیں کرتا مجھ سے۔“ اس نے ہمت کر کے کہنا شروع کیا۔ دو جملوں کے بعد اسے سب کچھ بھول گیا۔ جو یاد تھا اسے وہ ڈاکٹر سبط علی کو نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے اتنے دنوں میں اس کی یا اس کے کپڑوں کی تعریف نہیں کی۔ اس کے ساتھ سحری نہیں کی۔ افطاری نہیں کی۔ آئس سے دیر سے آتا ہے۔ صبح اس کو تائے بغیر گھر سے چلا جاتا ہے۔ اسے اتنے دنوں سے فرقان کے گھر کا کھانا کھلا رہا ہے۔ اور اسے شادی کے دوسرے دن سعیدہ اماں کے پاس چھوڑ گیا۔ ڈاکٹر سبط علی نے اس کی دونوں شکایات پر غور کیے بغیر اس سے کہا۔

www.facebook.com/urdu novels pdf

”اس نے آپ سے کسی اور شادی کا ذکر کیا ہے؟“ وہ چند لمحوں کے لیے ہونٹ کاٹتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے سعیدہ اماں سے جھوٹ بولا ہے اور یہی وہ جھوٹ تھا جس نے سعیدہ اماں کو اس قدر ناراض کر رکھا تھا۔ ”نہیں، سعیدہ اماں کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہوگی۔ ایسا تو کچھ نہیں ہے۔“ اس نے سرخ چہرے کے ساتھ تردید کی۔ دوسری طرف فون پر ڈاکٹر سبط علی نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

”آپ کو پر سوں سعیدہ اماں کے پاس کیوں چھوڑ گیا؟“ انہوں نے دوسرے الزام کے بارے میں کوئی تبصرہ کیے بغیر کہا۔ ”جب آپ دونوں ہمارے گھر پر تھے تب تو آپ کا وہاں ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ راستے میں آپ لوگوں کا کوئی جھگڑا ہوا؟“ انہوں نے اپنے آخری جملے سے امامہ کو جیسے بتا دیا جواب دیا۔

”جی۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ۔۔۔“ ڈاکٹر سبط علی بات کرتے کرتے رک گئے۔ وہ سالار کے جس رویے کی منظر کشی کر رہی تھی وہ ان کے لیے نیا تھا۔

”ضمیر میں ڈرائیور کو بھیجتا ہوں“ آپ میری طرف آجائیں۔ سالار کو بھی افطار پر بلوا لیتے ہیں، پھر میں اس سے بات کر لوں گا۔“

امامہ نے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔ اس وقت بھی ایک چیز تھی جو وہ نہیں چاہتی تھی۔
”وہ آج کل بہت دیر سے آفس سے آرہا ہے۔ کل رات بھی نوبت آج آئی شاید آج نہ آ سکے۔“ اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

”میں فون کر کے پوچھ لیتا ہوں اس سے۔“ ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔
”جی۔“ اس نے جھٹکل کہا۔ وہ ان کے کہنے پر آنکھیں بند کر کے کسی سے بھی شادی کرنے پر تیار ہو گیا تھا، وہ افطار کی دعوت پر نہ آنے کے لیے کس مصروفیت کو جواز بنا؟
وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر سبط علی کو کیا جواب ملنے والا ہے۔ فون بند کر کے وہ بے اختیار اپنے ناخن کاٹنے لگی۔ یہ درست تھا کہ اسے سالار سے شکایتیں تھیں، لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ شادی کے چوتھے ہی دن اس طرح کی کوئی بات ہوتی۔

”ہیلو! سویٹ ہارٹ۔“ پانچ منٹ بعد اس نے اپنے سیل پر سالار کی چمکتی ہوئی آواز سنی اور اس کے ضمیر نے اسے بری طرح حلاوت کیا۔

”بندہ اٹھتا ہے تو کوئی مہیج ہی کر دیتا ہے۔ فون کر لیتا ہے۔ یہ تو نہیں کہ اٹھتے ہی میکے جانے کی تیاری شروع کر دے۔“ وہ بے تکلفی سے حالات کی نوعیت کا اندازہ لگائے بغیر اسے چھیڑ رہا تھا۔
امامہ کے احساس جرم میں مزید اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر سبط علی نے یقیناً ”اس سے فی الحال کوئی بات کیے بغیر اسے افطار پر بلایا تھا۔“

”ڈاکٹر صاحب ابھی افطار کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں آج آفس سے جلدی آجاؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔“ وہ اسے بتا رہا تھا۔
امامہ کو یک دم کچھ امید بندھی۔ وہ اگر پہلے گھر آجاتا تو وہ اس سے کچھ بات کر لیتی، کچھ معذرت کر کے اسے ڈاکٹر صاحب کے گھر متوقع صورت حال کے بارے میں آگاہ کر سکتی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہاں، یہ ہو سکتا تھا۔

”لیکن اگر تم جانا چاہو تو میں تمہیں بھجوا دیتا ہوں۔“ سالار نے اگلے ہی جملے میں اسے آفر کی۔
”نہیں۔۔۔ نہیں میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔“ امامہ نے بے اختیار کہا۔

”اوکے۔۔۔ میں پھر نہیں بتا دیتا ہوں۔ اور تم کیا کر رہی ہو؟“
اس کا دل چاہا، وہ اس سے کہے کہ وہ اس گڑھے سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے جو اس نے سالار کے لیے کھودا تھا۔

”فرقان کی ملازمہ آئے گی آج صفائی کرنے کے لیے، عام طور پر تو وہ صبح میرے جانے کے بعد آکر صفائی کرتی ہے لیکن تم اس وقت سو رہی ہو، تو میں نے اسے فی الحال اس وقت آنے سے منع کیا ہے۔ تم بھا بھی کو کال کر کے بتا دینا کہ وہ اسے کب بھیجیں۔“

وہ شاید اس وقت آفس میں فارغ تھا، اس لیے لمبی بات کر رہا تھا۔

”کچھ تو بولو یا۔ اتنی چپ کیوں ہو؟“

”نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ ایسے ہی۔“ وہ اس کے سوال پر بے اختیار گڑبڑائی۔ ”تم فری ہو اس وقت؟“ اس نے بے

حد محتاط سمجھے میں پوچھا۔

اگر وہ فارغ تھا تو وہ ابھی اس سے بات کر سکتی تھی۔

”ہاں“ ایویو ایشن ٹیم چلی گئی ہے۔۔۔ کم از کم آج کا دن تو ہم سب بہت ریلیکسڈ ہیں۔ اچھے کمٹنس دے کر گئے ہیں وہ لوگ۔“ وہ بڑے مطمئن انداز میں اسے بتا رہا تھا۔

وہ اس کی باتوں پر غور کیے بغیر اس ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ بات کیسے شروع کرے۔

”آج اگر ڈاکٹر صاحب انوائیٹ نہ کرتے تو میں سوچ رہا تھا رات کو کہیں باہر کھانا کھاتے۔ فور ٹریس میں

اینڈ سٹرل انگریزی ٹیشن لگی ہوئی ہے۔ وہاں چلتے۔۔۔ بلکہ یہ کریں گے کہ ان کے گھر سے ڈنر کے بعد فور ٹریس چلے جائیں گے۔“

چلو بھرپانی میں ڈوب مرنے کا محاورہ۔ آج پہلی بار امامہ کی سمجھ میں آیا تھا۔ یہ محاورہ ”نہیں کہا گیا تھا۔ واقعی بعض سچویشنز میں چلو بھرپانی بھی ڈوبنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ بات شروع کرنے کے جتن کر رہی تھی اور یہ کیسے کرے یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے! پھر میں ڈراڈاکٹر صاحب کو بتا دوں۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔“ اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتی سالار نے بات ختم کرتے ہوئے کال بند کر دی۔ وہ فون ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہ گئی۔



وہ تقریباً ”چار بجے گھر آیا تھا اور وہ اس وقت تک یہ طے کر چکی تھی کہ اسے اس سے کس طرح بات کرنی ہے۔ سالار اوپر نہیں آیا تھا۔ اس نے فون پر اسے نیچے آنے کے لیے کہا۔ وہ جب گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر بیٹھی تو اس نے مسکرا کر سر کے اشارے سے اس کا استقبال کیا۔ وہ فون پر اپنے آفس کے کسی آدمی سے بات کر رہا تھا۔

ہینڈ فری کان سے لگائے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی طرف ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ مسلسل اسی کال میں مصروف رہا۔ امامہ کی جیسے جان پر بن آئی تھی۔ اگر وہ سارے راستے بات کرتا رہا تو۔ ایک سگنل پر رکنے پر اس نے سالار کا کندھا تھپتھپایا اور بے حد خفگی کے عالم میں اسے کال ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ نتیجہ فوری طور پر آیا۔ چند منٹ مزید بات کرنے کے بعد سالار نے کال ختم کر دی۔

”سوری۔۔۔ ایک کلائنٹ کو کوئی براہم ہو رہا تھا۔“ اس نے کال ختم کرنے کے بعد کہا۔

”اسلام آباد چلو گی؟“ اس کے اگلے جملے نے امامہ کے ہوش اڑا دیے۔ (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)